جوہر اندیشہ
مشکور حسین یا

طابع ________ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

ناشر ________ مکتبہ اُردو ڈائجسٹ۔ سمن آباد۔ لاہور

مطبع ________ اُردو ڈائجسٹ پرنٹرز۔ بیرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

بار اوّل ________ مئی ۱۹۷۵ء

تعداد ________ دو ہزار

قیمت ________ بارہ روپے

انتساب

اپنے دوست

پروفیسر خالد مسعود صدیقی

کے نام
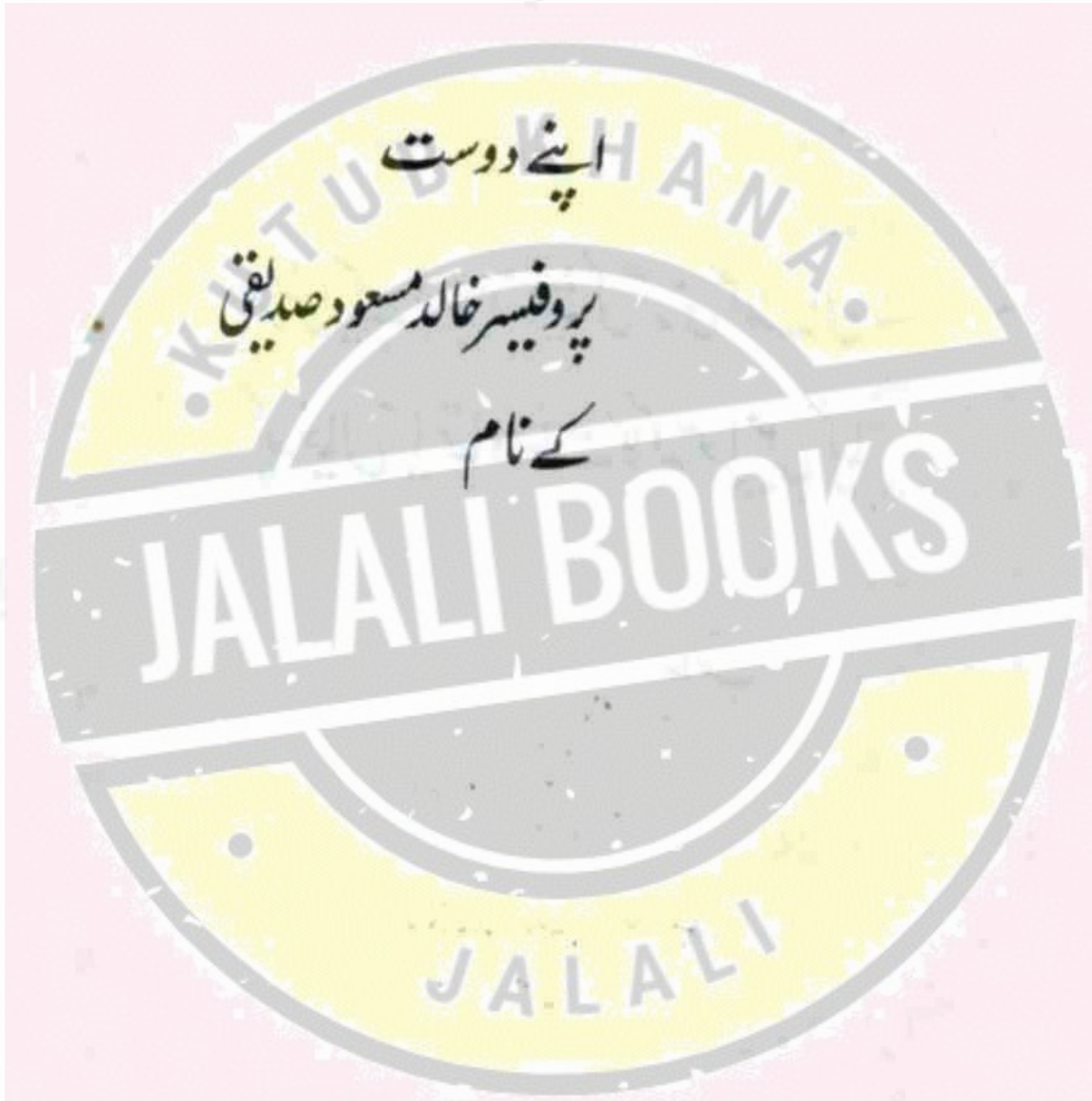
عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

(غالبؔ)

فہرست

ابتدائیہ

برسوں تک اردو ناقدین و محققین یہی طے نہیں کر سکے کہ انگریزی کی ایک معروف صنفِ ادب "ایسے" کو اردو میں کیا کہنا چاہیے۔ بڑی ردّ و کد کے بعد "انشائیہ" کا لفظ منظور ہوا، یا یوں سمجھ لیجیے کہ کثرتِ استعمال کے سبب منظور ہو گیا، ورنہ یہ بحث آج تک جاری ہوتی۔ "ایسے" کا اردو مترادف ڈھونڈنے میں اس تاخیر کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اردو میں انشائیہ نگاری کا آغاز ابھی حال ہی میں ہوا ہے۔ اس حقیقت کے اعتراف میں کسی قسم کے احساسِ کمتری کو دخل نہیں ہونا چاہیے کہ انگریزی ادب سے متعارف ہونے سے پہلے اردو میں "ایسے" کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ دراصل ہمارے فہمیدہ طبقے کا یہ ایک عجیب وطیرہ ہے کہ جس طرح ایٹم بم ایجاد ہونے پر یہ لوگ بزرگانِ ملت کے ارشادات میں سے ایٹم بم کی ایجاد سے متعلق پیش گوئیاں تلاش کرنے لگے تھے، بعینہٖ جب انگریزی تعلیم عام ہوئی اور انگریزوں کی تہذیبی زندگی میں "ایسے" کی مقبولیت اور اہمیت کا چرچا ہوا، تو اُردو کی پرانی داستانوں اور اُردو شعرا کے تذکروں میں سے "انشائیوں" کے ٹکڑے نکال نکال کر پیش کیے جانے لگے کہ دیکھیے ہمارے ہاں تو انشائیہ نویسی کی روایت بہت قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ یہ قطعی طور پر طفلانہ طرزِ عمل ہے اور ایک غلط قسم کی انا کو خود ہی تھپک لینے سے حقیقتیں بدل نہیں جایا کرتیں۔

پھر اگر ابھی چند برس پہلے تک اُردو میں انشائیہ کا — بحیثیت ایک منفرد صنفِ ادب — کہیں وجود نہیں تھا، تو آخر مغرب کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادب میں غزل کی سی رسیلی اور پُرکار صنفِ سخن کا بھی تو وجود نہیں ہے۔ ہر زبان کے ادب کی اپنی بعض منفرد اصناف ہوتی ہیں

اور اگر ان میں سے کوئی صنف ہمارے لیے کارآمد ثابت ہوسکتی ہے اور ہمارے مزاج کے مطابق ہے، تو اسے کسی نفسیاتی الجھن کے بغیر، علی الاعلان اپنا لینا چاہیے۔ اگر ہم نے انگریزی کے "ایسے" کو انشائیہ کے نام سے اپنا لیا ہے تو اس میں ہماری کوئی ہیٹی نہیں ہے اور اسے اردو کی ایک قدیم صنفِ ادب ثابت کرنا سادہ لوحی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

انشائیہ انگریزی تعلیم اور انگریزی ادب کے مطالعے کی دین ہے اور اس کا رواج حال ہی میں ہوا ہے۔ اس صورت میں ہمیں یہ تعین بھی کرنا ہوگا کہ اردو میں نہایت متانت اور استقامت کے ساتھ انشائیہ نویسی کا سہرا کس کے سر ہے۔ کوئی اس کا آغاز سرسیّد کے مضامین سے کرتا ہے اور کوئی مرزا غالب کے خطوط سے، لیکن یہ محض دُور کی کوڑی لانا ہے۔ اسی طرح رشید احمد صدیقی کو انشائیہ نویس قرار دینا خود ان کے ساتھ زیادتی ہے کہ ان کے مضامین، انشائیے کی کسوٹی پر کسی طرح بھی پُورے نہیں اُترتے اور نہ خود انھیں انشائیہ نویسی کا دعویٰ ہے۔ حق بات یہ ہے کہ انگریزی "ایسے" کے انداز میں، اردو میں انشائیے لکھنے کی اکا دکا کوششیں تو گزشتہ ایک صدی میں ہوتی رہی ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ زمانۂ حال میں جن اہلِ قلم نے انشائیہ نگاری کو اظہار کا ذریعہ بنایا ہے، ان میں سیّد مشکور حسین یاد کا نام سرِفہرست ہے اور فی الحال وہی اس صنفِ ادب کے منتہی معلوم ہوتے ہیں۔

انشائیے کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ اپنی ذات کے بارے میں لکھیے، کائنات کے بارے میں لکھیے۔ کسی ایک نکتے پر زور دیجیے یا بہت سے نکات کو باہم مربوط کر دیجیے۔ صرف اندرونی بصیرت سے کام لیجیے یا اس میں بصارت کو بھی شامل کر لیجیے آپ جو چاہیں، کیجیے یعنی اپنے خیالوں، جذبوں، تجربوں اور مشاہدوں کے ساتھ کھُل کھیلیے، مگر یاد رکھیے اُسی وقت کوئی صنفِ ادب کا منصب حاصل کرتی ہے، جب اس کے چند ضابطے اور اصول معین کر لیے جائیں؛ چنانچہ ایک نہایت "آزادہ رو" صنفِ ادب ہونے کے باوجود، اظہار و اسلوب کے معاملے میں انشائیہ کے چند اپنے مطالبات ہیں اور دورِ حاضر میں سیّد مشکور حسین ہی ایک ایسے انشائیہ نویس ہیں جنھوں نے اس صنفِ ادب کی تمام آزادیوں سے کماحقہٗ استفادہ کرنے کے باوجود اس کے "ڈسپلن" کی پابندی

کی ہے اور ان حدود کا لحاظ رکھا ہے جنھیں پھاند جانے کے بعد انشائیہ، انشائیہ نہیں رہتا، مضمون بن جاتا ہے۔ اُردو میں انشائیہ نگاروں کو مضمون نگاروں سے الگ پہچاننے کے لیے سیّد مشکور حسین یاد کے انشائیوں کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ یہ انشائیے اس صنفِ ادب کے نہایت بلیغ اور موثر نمونے ہیں۔

سیّد مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں وہ تمام خصوصیات متوازن اور متناسب صورت میں موجود ہیں جو آج ہمیں مغربی زبانوں کے ترقّی یافتہ "ایسے" میں نظر آتی ہیں، البتہ اُنھوں نے ان میں ایک خصوصیّت کا اضافہ کیا ہے اور یہ پاکستانی فکر، پاکستانی ماحول، پاکستانی تہذیب و تمدّن، یعنی پاکستانیت کا اضافہ ہے۔ کوئی صنفِ ادب چاہے کتنی ہی عالمگیر کیوں نہ ہو، ہر ملک کا ادیب اس میں اپنی ملکی انفرادیتوں کا اضافہ کیے بغیر اظہار کرنا چاہے گا، تو زیادہ سے زیادہ ایک سلیقہ مند نقّال ہی بن سکے گا۔ سیّد مشکور حسین یاد چاہے کسی بھی موضوع پر انشائیہ لکھ رہے ہوں، وہ اس موضوع کی مخصوص قومی معنویتوں سے کتراتے نہیں ہیں اور یوں اس لحاظ سے، وہ اردو انشائیہ کے بانی نہ سہی، پاکستانی انشائیہ کے بانی ضرور ہیں۔

بعض اصحاب، خاص طور پر وہ لوگ، جو زندگی کے بارے میں کوئی واضح نقطۂ نظر اپنانے سے ڈرتے ہیں (کیونکہ ہر نقطۂ نظر کسی نہ کسی مرحلے پر، کوئی نہ کوئی قربانی ضرور طلب کرتا ہے) مقصدیّت کو انشائیہ نویسی کے منافی سمجھتے ہیں۔ کسی زمانے میں شاعری سے متعلق بھی اسی طرح کا ڈھکوسلا چلایا گیا تھا اور غزل کو تو بطورِ خاص ایسی چھوئی موئی قرار دیا گیا تھا جسے مقصدیّت کا شائبہ بھی مرجھا سکتا تھا۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ کوئی بھی شخص، کوئی بھی کام کسی مقصد کے بغیر نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو وہ دماغی طور پر متوازن نہیں ہے۔ انشائیہ تو بہر حال ایک صنفِ ادب ہے اور مقصدیّت اسے نکھارتی، سنوارتی اور بامعنی اور دل چسپ بناتی ہے۔ سیّد مشکور حسین یاد کے انشائیے مقصدیت سے مملو ہیں (اور ادب میں مقصدیّت ہمیشہ بین السطور ہوتی ہے) ان کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کو زندہ رہنے کے قابل بنایا جائے۔ زندگی کے اس اثبات کے بغیر انشائیے میں وہ تازگی اور شگفتگی پیدا نہیں ہو سکتی، جس کی غیر موجودگی میں انشائیہ، جوابِ

مضمون بن کر رہ جاتا ہے۔ سیّد مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں جو چہل پہل کی سی کیفیت ہے، وہ اسی مثبت مقصدیّت کا نتیجہ ہے۔

جو لوگ سیّد مشکور حسین یاد سے ذاتی طور پر متعارف ہیں، جانتے ہیں کہ انشائیہ ان کے مزاج و ذہن — ان کی افتادِ طبع کے عین مطابق ہے۔ وہ گفتگو بھی کرتے ہیں تو انشائیہ بولتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ وہی جذبے کی گرمی اور گہرائی، وہی کرید اور جستجو جو مسائل پر فکر کرنے کی بنیادی شرط ہے، ساتھ ہی وہی تازگی، شگفتگی اور بے ساختگی — یعنی ایک کامیاب انشائیے کی سبھی خصوصیات — ان کی گفتگو میں موجود ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان کے انشائیوں میں شعر کی سی روانی ہے۔ ساتھ ہی انھیں زبان و بیان پر بھی استادانہ قدرت حاصل ہے اور وہ علوم کے متعدد شعبوں پر بھی حاوی ہیں۔ اسی لیے بعض اوقات گہرے فکری مسائل کو انشائیہ کا موضوع بنانے کے باوجود ان کے ہاں زبان کی سلاست اور بیان کی لطافت کا حسن دیدنی ہوتا ہے۔ یوں وہ اردو انشائیہ نویسی میں ایک ایسے امتیازی مرتبے کے مالک ہیں جس تک فی الوقت کسی کی رسائی نہیں۔

احمد ندیم قاسمی

لاہور

۵- نومبر ۱۹۷۳ء

کتاب

لکھنے والوں میں ذہانت برائے نام ہوتی ہے۔ ذہین ہونے کا زیادہ تعلق پڑھنے والوں سے ہے۔ قاری ذہین نہ ہوں تو کتاب کون پڑھے؟ اس کے علاوہ کتابوں میں ہوتا بھی کیا ہے۔ یہی ایک آدھ سوال ــــ بڑے سے بڑا مصنف بہت زور مارتا ہے تو اپنی تصنیف میں ایک کے بجائے ڈیڑھ یا پونے دو یا حد سے دو سوال کر لیتا ہے۔ حالانکہ اس دوسرے سوال کو پہلے سوال کی پرچھائیں سے زیادہ اہمیت کبھی حاصل نہیں ہوتی اور بس ــــ سوال ختم، کتاب ختم۔ کتاب کو زندہ رکھنا، اُس کی قدر و قیمت متعین کرنا، اُس کے ایک سوال کو ایک لاکھ سوال بنانا یہ سب کام پڑھنے والوں کا ہے۔ پڑھنے والے نہ ہوں تو لکھنے والوں کا ناطقہ بند ہو جائے۔ دراصل کتاب پڑھنے والوں کی چیز ہے لکھنے والوں کی نہیں۔ کتابوں پر مصنفین اپنے نام لکھوا کر اچھی خاصی حماقت کا ثبوت دیتے ہیں۔

کتاب لکھنا سراسر حماقت ہے۔ ایک تو لکھنے والے کی عزت بازار میں نیلام ہو جاتی ہے۔ دوم پڑھنے والوں کو مفت میں سر کھپانا پڑتا ہے۔ کتاب جس قدر اعلیٰ معیار کی ہوگی، اُسی قدر قاری کے لیے مصیبت بنے گی۔

حماقت اور فراست میں دوستی ناممکن ہے۔ اسی طرح جہالت اور علمیت میں بھی سمجھوتے کی صورت بآسانی پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن حماقت اور جہالت میں اکثر گٹھ جوڑ ہو جاتا ہے۔ کتاب اسی گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مصنّف احمق اور قاری جاہل نہ ہوں تو کوئی کتاب ضبطِ تحریر میں نہ آئے۔ مصنّف کی صریح حماقت یہ ہے کہ وہ اپنے خیال کو دُنیا کے سر منڈھنا چاہتا ہے۔ اور قاری کے جاہل ہونے کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ وہ ہر اُلٹی سیدھی بات پر غور کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ ایک کو علم کی پیاس بجھانے کی لگن جاہل بنائے رکھتی ہے اور دوسرے کو اپنے خیال کی عظمت منوانے کا شوق حماقتوں پر مجبور کرتا رہتا ہے۔

کتابوں کے نہ ہونے سے انسان کی جہالت میں تو خیر کوئی فرق واقع نہ ہوتا، البتہ دُنیا بہت سی حماقتوں سے یقیناً بچ جاتی۔ مطلب یہ ہے کہ کتابوں کے ذریعے علم کی اتنی اشاعت نہیں ہوئی جتنا حماقتوں نے رواج پایا۔ (مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں کہ بہت سے علوم خود منجملہ حماقت ہائے انسانی ہوتے ہیں) اس کے علاوہ کتابوں کا علم بغیر عمل نری حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

خود پر کتابیں لدوا کر غریب گدھا تو واقعی عالم نہیں بنتا لیکن قارئین مجھے معاف فرمائیں، کتابیں پڑھنے سے آدمی میں گدھا بننے کے سو فی صد امکانات ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، جب دیکھو خیالات میں غرق۔ دیوار کا سہارا لے کر سوچا جا رہا ہے۔ سڑک کے عین درمیان کھڑے ہو کر سوچا جا رہا ہے۔ چل رہے ہیں تب سوچ رہے ہیں، بیٹھے ہیں تب سوچ رہے ہیں۔ بہت موج میں آئے تو وقت بے وقت بولنا شروع کر دیا۔ قصہ یہ ہے کہ کتابیں سوچنا کم سکھاتی ہیں اور جان کو نوچنا زیادہ۔ قاری مفکّر بننے کی بجائے متفکّر ہو جاتا ہے۔ اُس کی سوچ اُسے کوئی راہ نہیں دکھاتی بھنور میں لا ڈالتی ہے۔ اور پھر طُرفہ تماشا یہ ہے کہ مصنّف کے اِس چکّر میں

جس قدر زیادہ قاری آکر پھنستے ہیں وہ یعنی مصنف اپنی اس حماقت کو اُسی قدر اپنی کامیابی اور عظمت گردانتا ہے۔ لوگوں کو ہم خیال بنانے کی کوشش سے بڑھ کر کوئی حماقت کیا ہو سکتی ہے؟

ہم خیال بنانے کی تمام کوششیں خوف کی بنا پر ہوتی ہیں۔ خوف کا فلسفہ سمجھ میں آجائے تو کوئی کسی کو ہم خیال بنانے کی سعی نہ کرے۔ لیکن خوف کا فلسفہ سمجھے کون؟ یہ تو مسلّح دشمن سے نہتے ہو کر مقابلہ کرنے والی بات ہے۔

ہر وجود ایک الگ طاقت رکھتا ہے۔ اور ہر طاقت کی اپنی ایک سمت ہوتی ہے۔ ہم خیال بنانے کی فکر میں انسان نہ صرف دوسروں کی طاقت کو نقصان پہنچاتا ہے بلکہ اپنی طاقت کو بھی کمزور کر لیتا ہے۔ (حالانکہ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ ہم خیال بنا کر ہم اپنی طاقت کو مضبوط کرتے ہیں) درحقیقت ہوتا یہ ہے کہ یا تو طاقتوں کی رفتار میں سُستی واقع ہو کر درماندگی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے یا رفتار میں تیزی آ کر کوئی حادثہ رُونما ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں پٹڑی سے اُتر جانا عام بات ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ پٹڑی سے اُترے تو اپنی سمت بھی گئی اور طاقت کا بھی خاتمہ ہوا۔ اونچی سے اُونچی کتاب میں یہ آرزو کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوتی ہے کہ دوسری طاقتوں کو اُن کی مخصوص سمتوں سے ہٹا کر اُس سمت میں چلایا جائے جس کی طرف مصنّف اشارہ کر رہا ہے۔

دُنیا میں دو ہم خیال انسانوں کا ڈھونڈ نکالنا بھی ممکن نہیں۔ انفرادیت خیال کی سب سے بڑی خصوصیّت ہے۔ ہم کسی کو اپنے خیال سے متاثّر تو کر سکتے ہیں، لیکن اس کے خیال کو اپنا خیال کبھی نہیں بنا سکتے۔ کتاب اسی ناممکن بات کو ممکن بنانے کی ناکام کوشش سے ظہور میں آتی ہے۔

اظہارِ خیال اظہارِ ذات ہے۔ اظہارِ ذات سے ہم دوسروں تک نہیں پہنچتے، دوسروں کو بھی ہم تک آنے کا موقعہ ملتا ہے۔ کتاب ایسے مواقع بہم پہنچانے کا مؤثّر ترین ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے بشرطیکہ قاری اور مصنّف راستے ہی میں گم نہ ہو جاتے ہوں۔ یہ دونوں گم ہو جائیں تو کتاب بھی

کہیں نظر نہیں آتی۔ کتاب کی نمود کے لیے ان کا اپنی اپنی جگہ قائم رہنا لازمی ہے۔

مصنّف، قاری اور کتاب، تینوں کی زندگی کا راز کھیل میں مضمر ہے۔ جس طرح اعلیٰ معیاری ادب کھیلتے کھیلتے "تخلیق" ہوتا ہے۔ اسی طرح کھیلتے کھیلتے "پڑھا" بھی جاتا ہے۔ سنجیدگی انسان کو کھانا، پینا، پہننا، اوڑھنا اور چار دیواری میں رہنا تو سکھا دیتی ہے یعنی انسان کو معقول جانور تو پوری طرح بنا دیتی ہے لیکن انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے اِس کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اعلیٰ انسانیت کو فروغ دینے یا اپنی ذات میں جذب کرنے کے لیے سنجیدہ ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ کتاب لکھنا اور پڑھنا دونوں ہی غیر سنجیدہ کام ہیں۔ اِن کاموں میں جہاں سنجیدگی پیدا ہوئی اور یہ اپنے معیار سے گِرے۔ سنجیدہ ہو کر آدمی اُونچا نہیں جا سکتا۔ بلندیوں کو چھُونے کے لیے زقند لگانا پڑتی ہے اور آپ نے کبھی کسی سنجیدہ آدمی کو زقند لگاتے نہیں دیکھا ہو گا۔ میں سنجیدگی کی مذمت نہیں کر رہا ہوں۔ روزمرّہ کے کاموں کے لیے انسان کو ضرور سنجیدہ ہونا چاہیے۔ البتہ کسی بڑے کام کو (جو عموماً غیر سنجیدہ اور نامعقول ہوتا ہے) انجام تک پہنچانے کے لیے ہمیں غیر سنجیدہ ہونے کی سخت ضرورت ہے۔ بہت بڑے باعمل آدمی اور بہت بڑے بے عمل آدمی میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ اوّل الذکر عمل پیرا ہو کر دنیا کو اپنی حماقتوں سے متحیّر کرتا ہے اور موخرالذکر فقط کتاب لکھ کر یعنی اپنی نامعقولیت کے اظہارِ محض سے ہمیشہ کے لیے قارئین کے استعجاب کا باعث بن جاتا ہے۔ کتاب آرزوؤں، تمناؤں اور حسرتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ آرزوئیں اور تمنائیں خواہ کتنی ہی جلیل و جمیل کیوں نہ ہوں، جب تک عملی صورت اختیار نہیں کرتیں معقولیت اور سنجیدگی کے دائرے سے باہر رہتی ہیں۔

معقولیت اور سنجیدگی، عقل اور سمجھ سے پیدا ہوتی ہے اور کتاب میں انہی چیزوں کا فقدان ہوتا ہے۔ عقل اور سمجھ سے کتاب لکھی جائے تو پھر وہ کتاب نہیں رہتی، معلومات اور اطلاعات

کا ذخیرہ یعنی انسائیکلوپیڈیا اور اخبار وغیرہ قسم کی چیز بن جاتی ہے۔ معلومات میں اضافہ کرنا کتاب کا منصب نہیں ہے۔ منقولات اور معقولات کے بجائے ایک بلند پایہ تصنیف میں، بچّوں کی سی ضدیں ہوا کرتی ہیں جن کا معنویت سے بظاہر کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

کتاب زندگی میں تازگی پیدا کرتی ہے۔ مہمل اور بے معنی قسم کی دشواریوں کو جنم دیتی ہے۔ ہم سے اُلٹے سیدھے مطالبات کرتی ہے۔ ہمیں اوٹ پٹانگ باتیں سُناتی ہے۔ بے تُکے قصّے جن کا کوئی سر ہوتا نہ پیر ہمیں سُننے پر مجبور کرتی ہے۔ غرض کتاب علم و آگہی کے پیچھے نہیں بھاگتی، علم و آگہی کتاب کے پیچھے بھاگتے ہیں۔

انسان اکتسابِ علم کے لیے قدریں متعیّن نہیں کرتا۔ تخلیقِ اقدار میں "جاننے" کے بجائے "ماننے" کی خواہش کار فرما ہوتی ہے۔ یہاں علم سے پہلے یقین کے قدم آگے بڑھتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے علم بعد کی چیز ہے اور یقین پہلے کی — علم نہ ہو تو یقین حاصل ہو سکتا ہے، یقین نہ ہو تو علم حاصل نہیں ہو سکتا۔

"جاننے" سے پہلے "ماننے" کی بات حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن اسی حماقت پر پوری انسانیت کا دار و مدار ہے۔ سارے علوم و فنون اسی حماقت سے دائم و قائم ہیں۔ اعلیٰ انسانی اقدار اور بُلند اصول سب کی سب حماقت۔ انسان حماقتیں نہ کرے تو ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتا۔ کتاب ایسی ہی حماقتوں سے معرضِ وجود میں آتی ہے اور لوگوں کے دلوں میں یقین کی شمعیں روشن ہو جاتی ہیں۔ علم کیا شے ہے؟ آگہی کسے کہتے ہیں؟ اس کی خبر لکھنے والے کو نہ کبھی ہوئی اور نہ کبھی ہو گی۔

لے سانس بھی آہستہ

میری اِس تمام گفتگو کا آغاز میرؔ کے اِس مشہور شعر سے ہوتا ہے ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہِ شیشہ گری کا

ہم میں زمان و مکاں کی نزاکت کا احساس جاگ اُٹھے تو شاعر کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ اصولِ نزاکت تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔ یہ اصولِ نزاکت کیا ہے؟ میر صاحب نے اپنے شعر میں اسی کا احساس دلانے کی سعی فرمائی ہے۔

عام طور پر نزاکت کے ساتھ ناتوانی کا تصوّر وابستہ کیا جاتا ہے۔ شے کی انفرادی نزاکت میں ہم کسی حد تک اس تصور کو شامل کر سکتے ہیں لیکن آفاقی نزاکت پر غور کرتے وقت ذہن اس کی طرف ذرا سا بھی منتقل نہیں ہوتا۔ دراصل نزاکت خواہ کسی قسم کی ہو ناتوانی نہیں ہے۔ کمزور چیز فنا ہو جاتی ہے نازک چیز فنا نہیں ہوتی۔ نزاکت تسلسلِ حیات کے ساتھ قائم رہتی ہے اور ناتوانی کا کوئی تسلسل نہیں ہوتا۔ کمزور چیز ٹوٹے پھوٹے بغیر بھی مٹ جاتی ہے اور نازک چیز ٹوٹنے پھوٹنے پر بھی نہیں مٹتی۔ ناتواں ہونے اور نازک ہونے میں مٹنا اور نہ مٹنا ایک اہم فرق ہے جو ناتوانی اور نزاکت میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔

اسی لیے ناتواں کو گرفت میں لینا آسان ہے اور نازک کو ہاتھ تک لگانا مشکل۔ فنا ہونے والی اشیا کو ہر کوئی تصرف میں لے سکتا ہے۔ باقی رہنے والی چیزوں تک بہت کم لوگوں کی رسائی ہوتی ہے۔ طاقتور سے طاقتور شئے کو اگر وہ نازک نہیں ہے تو معمولی سی کوشش سے گرفت میں لیا جا سکتا ہے۔

طاقت کی مثال ایک ایسے پکے ہوئے پھل سے دی جا سکتی ہے جو ہر لمحہ شاخ سے ٹوٹ گرنے کو تیار رہتا ہے۔ گویا طاقت ایک طرح کی خود سپردگی ہے۔ ارادہ و اختیار سے بیگانہ۔ جبر کا عنصر اس میں ضبط اور ٹھہراؤ پیدا کرتا ہے۔ طاقت کی مجبوری مختاری ہے۔ جبر کے بغیر یہ ابتری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ طاقت مجبور ہو کر مضبوط ہوتی ہے اور مضبوطی کے باعث اس میں نازکی کے بے شمار پہلو پیدا ہو جاتے ہیں۔

تمام کائنات ایک طاقت ہے۔ ایک ایسی طاقت جسے نزاکتوں نے سنبھالا ہوا ہے۔ نزاکت معانی کے عظیم الشّان سلسلوں سے عبارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کی کوئی شئے نزاکت سے عاری نظر نہیں آتی۔

نازک ہونا ادق اور پیچیدہ ہونا ہے۔ کوئی بات ادق اور پیچیدہ نہ ہو تو فوراً سمجھ میں آجاتی ہے۔ اوّل تو فوراً سمجھ لینا ذہانت سے زیادہ نا سمجھی کی دلیل ہے۔ علاوہ ازیں فوراً سمجھ میں آنے والی بات اکثر ناپائدار ہوا کرتی ہے، خود اپنی ذات کے حوالے سے بھی اور سمجھنے والے کی ذات کے حوالے سے بھی۔ لہٰذا سمجھنے کے لیے اور سمجھ میں آنے کے لیے تأمّل ضروری ہے۔ پیچیدگی نے انسانی فکر کو ابھارا اور انسانی فکر نے زندگی کی ابدیّت اور سلامتی کا بیڑہ اُٹھایا۔

دُنیا نازک حالات سے نہ گزرتی تو کوئی اُسے کبھی سمجھنے کی تکلیف گوارا نہ کرتا۔ نزاکت نے انسان کو عرفان و آگہی کے لامتناہی خزانوں سے مالا مال کیا ہے۔ دنیا کو مہمل وہ لوگ خیال

کرتے ہیں جن میں اس کے معانی سے آنکھیں چار کرنے کی سکت نہیں ہوتی۔ نازک ہونا ایسا ادق ہونا اور پیچیدہ ہونا ہے جو سمجھ میں آ کر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔

کائنات نازک مقامات سے معمور ہے اور زندگی نازک لمحوں سے بھرپور، یہی وجہ ہے کہ دونوں کا مکمل عرفان ممکن نہیں۔ اگر کوئی چیز پوری طرح سمجھ میں آجائے تو پھر وہ نہ صرف ہمیشہ کے لیے آزادی سے محروم ہو جاتی ہے بلکہ اُس کے ارتقا کا سلسلہ بھی منقطع ہو جاتا ہے۔ مکمل عرفان، آزادی اور ارتقا کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے۔ نزاکت اس پتھر کو ہمارے سامنے اس طرح ریزہ ریزہ کر کے لاتی ہے کہ اس کی ہر کرچ میں ستاروں کی سی تابانیاں نظر آتی ہیں جن کے سہارے ہم زندگی کے سفر میں اپنے قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ کائنات اور زندگی کو آزادی اور ارتقا بے حد عزیز ہیں۔

نزاکت، آزادی اور ارتقا دونوں کی ضامن اور پیغامبر ہے۔ ضامن اس طرح کہ ہم کسی نازک شے یا خیال کو ہزار گرفت میں لانے کی سعی کریں، ہمیں آخر دم تک یہی احساس رہتا ہے کہ ہم اُسے بدرجہ اتم اپنی گرفت میں نہیں لا سکے ہیں۔ طلب کی راہ میں سب کچھ حاصل کر کے بھی کچھ زیادہ حاصل نہ کرنے کا احساس محض مطلوب کو مرور زمانہ سے نہیں بچاتا بلکہ طالب کی آزادی کو بھی برقرار رکھتا ہے۔ طلب قائم رہے تو طالب و مطلوب دونوں آزاد اور مائل بہ ارتقا رہتے ہیں۔ نزاکت طلب کو کبھی نہیں مرنے دیتی۔ اور یوں وہ ہمیشہ آزادی کی ضامن رہتی ہے۔ آزادی اور ارتقا کے ضمن میں نزاکت کی پیغمبری کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ نازک موقع و محل کے احساس کی بدولت انسانی قوائے فکر و عمل جس وسعت و ندرت کا مظاہرہ کرتے ہیں اس کی مثال ہمیں عام احساسِ حیات کی صورت میں نظر نہیں آتی بلکہ اگر سچ پوچھا جائے تو زندگی کا بھرپور احساس ہی اُس وقت ہوتا ہے جب آدمی اپنے آپ کو نازک حالات سے گزرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

غرض نزاکتِ غم ہو یا نزاکتِ مسرت یعنی کسی قسم کی نزاکت کیوں نہ ہو اُس کو سمجھنے اور محسوس کرنے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے وہ احتیاط ہے۔ غیر محتاط ہو کر انسان نہ صرف خود کو نزاکت کے احساس سے محروم کر لیتا ہے بلکہ زندگی کی ہر صداقت اُس پر حرام ہو جاتی ہے۔ لیکن یہاں ہمیں احتیاط کے مفہوم کو بخوبی ذہن نشین کرنا ہوگا۔ احتیاط کسی خوف کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ خوف پریشانی پیدا کرتا ہے اور پریشان آدمی کبھی محتاط نہیں رہ سکتا۔ اس کے برعکس سچی احتیاط تو اطمینان و اعتماد کی فعال کیفیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جیسے ہی انسان کا اعتماد عملی صورت اختیار کرتا ہے اُس کے کردار میں احتیاط کی صفت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ کوئی جس قدر محتاط ہوتا ہے اُس میں اُسی قدر زندگی کے تجربات سے بہرہ ور ہونے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیئے تو اُسے محتاط نہ سمجھنا چاہیے۔ ایسے شخص کو بلا تامّل ڈرپوک کہا جا سکتا ہے۔ محتاط ہونے سے اُس کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ بیک وقت دو تجربوں کا ضیاع کرتا ہے۔ ایک تو دودھ کے جلنے کے تجربے کو اپنے شعور میں نہیں ڈھالتا دوسرے چھاچھ پینے کے تجربے کو وہ مسخ کر رہا ہوتا ہے۔ آپ احتیاط کرنے والے کو اس قسم کی غلطی کا کبھی مرتکب نہیں پائیں گے۔

ہر تجربہ سچائی کی تلاش بن سکتا ہے۔ لیکن ہر تجربہ سچائی کی تلاش نہیں ہوتا۔ انسان کہلانے کی ایک کڑی شرط یہ بھی ہے کہ ہر تجربہ کو سچائی کی تلاش بنایا جائے۔ اس اہم ترین کام میں اگر کوئی ہمارا صحیح معنوں میں معاون و مددگار ہو سکتا ہے تو وہ نزاکت کا احساس ہے جس پر احتیاط کی بنیادیں استوار ہوتی ہے۔

سچائی نہ چھپنے کی چیز ہے، نہ آشکار ہونے کی۔ اس کا نہ کوئی ظاہر ہے اور نہ باطن، یہ نہ آنکھوں کے سامنے ہے، نہ دل کے اندر۔ یہی وجہ ہے کہ حقائق کو سنگین اور ملائم یا خوشگوار اور

ناخوشگوار تو کہا جا سکتا ہے لیکن جھوٹا یا سچّا نہیں کہا جا سکتا۔ حقیقتوں کا جھوٹ اور سچ سے براہِ راست کوئی رشتہ قائم نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو انسان (جو حقائق کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کے نتیجہ میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے) کبھی کا خود کو ختم کر چکا ہوتا اور یہ دنیا مدت سے ویرانہ بن گئی ہوتی۔ حقائق کی ساری نمود و نمائش اسی لیے قائم ہے کہ وہ صدق و کذب سے علیحدہ اپنا ایک وجود رکھتے ہیں۔ اگر حقیقتیں بذاتِ خود سچائیاں بھی ہوتیں تو انسان کے حوالے سے زندگی اور کائنات کا نقشہ وہ نہ ہوتا جو آج ہے یا آئندہ جس کی ہم اُمید رکھتے ہیں۔ حقائق کی حیثیت تو ایک سٹیج کی سی ہے۔ عمل و حرکت کا تمام ربط و ضبط صداقت کے ذریعے ظہور میں آتا ہے اور صداقت انسان کے احساس نزاکت سے تشکیل پاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ انسان محتاط ہوتا ہے تو حقائق صداقتوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ احتیاط صداقت کا معیار ہے۔ آدمی جس قدر محتاط ہوگا اُسی قدر صادق و صدیق بھی ہوگا اور اُسی نسبت سے اُس پر حیات و کائنات کی صداقت بھی واضح ہوگی۔ احتیاط گویا عرفان و آگہی کے دروازوں کی کنجی ہے اور زندگی کے بھیدوں کو معلوم کرنے کی واحد تدبیر۔ محتاط ہو کر ہم اپنے گرد حفاظت کی دیواریں کھڑی نہیں کرتے بلکہ احتیاط کی بے پناہ طاقت کے ذریعے جہالتوں کے حصار پاش پاش کرتے ہیں۔ چنانچہ میر صاحب کی اس تلقین میں کہ سانس بھی آہستہ لو، یہی مقصد موجود ہے کہ ہمیں اس کارگہ شیشہ گری میں احتیاط کی بدولت اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا عرفان ہوتا رہے اور ہم بحیثیت انسان اپنے مقام کو پہچاننے میں کامیاب ہو سکیں۔

سطح

سطح ہر سفر کا نقطۂ آغاز ہے۔ ایسا نقطہ جس کا تعین کیے بغیر ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ دنیا کو برتنے کے لیے ہی نہیں اُس پر غور کرنے کے لیے سطحی ہونا ضروری ہے۔ پانی کو پہلے پانی تسلیم کریں تب کہیں بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ مفرد نہیں مرکب ہے۔

لطیف ہو یا کثیف سطح تمام تر احساس ہے۔ یہ ایک تیز تلوار کی طرح کاٹ کرتی ہے، اس سے ہمارے جسم و جاں ہر وقت فگار ہوتے رہتے ہیں۔ سطح دکھ پہنچائے یا سُکھ ہر حال میں ہمیں چونکاتی اور بیدار کرتی ہے۔ ہم پر سطح کے اَن گنت احسانات ہیں۔

بقول شخصے ہماری ذات ایک ایسی عمارت کے مانند ہے جس کے بے شمار دروازے ہیں۔ ان دروازوں سے ہر لمحہ سطح کی آمد جاری رہتی ہے۔ عمارت میں داخل ہو کر یہ سطح مختلف احساسات کا رُوپ دھار لیتی ہے۔ احساس میں تبدیل ہوتے ہی سطح کو پر لگ جاتے ہیں، یہ کبھی نُور ہوتی ہے تو کبھی نار ـــــــ

وقت کو کسی نے نہیں دیکھا، کسی نے نہیں پایا، لیکن سطح کی بدولت ہمیں اُس کے صد ہا رُوپ نظر آجاتے ہیں۔ سطح نہ ہوتی تو وقت خلاؤں میں مارا مارا پھرتا۔ وقت سطح کے دامن میں پروان

چڑھ رہا ہے۔

سطح کا دامن بڑا وسیع ہے۔ اس کی آغوش میں اندھیرا بھی ہے اور اُجالا بھی۔ یہاں تلخیوں کو بھی پناہ ملتی ہے اور حلاوتوں کو بھی ـــ اس کے سائے میں پھول اور کانٹے دونوں پرورش پاتے ہیں ـــ سطح مٹ جائے تو زندگی کی زنگارنگی ختم ہو جائے۔ تضاد کا سارا لطف سطح سے قائم ہے ـــ ہر چمکتی ہوئی شے سونا ہو یا نہ ہو، چمک اپنی جگہ ایک قدر و منزلت رکھتی ہے۔ ہم سطح سے اُسی وقت دھوکا کھاتے ہیں جب اُس کے حُسن و جمال کو اپنی غرض کے تحت ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ غرض شاملِ حال نہ ہو تو ظاہر و باطن کا فرق بھی یک گونہ مسرت بخش دیتا ہے۔ ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے سب سطح ہے، بلندی پر جائیں یا گہرائی میں اُتریں سطح ہمارے ساتھ رہتی ہے ـــ ہم بھی کس قدر ستم ظریف واقع ہوئے ہیں جو چیز ہمیں سہارا دیتی ہے جس پر ہمارے پاؤں ٹھہرتے ہیں اُسی کو ہم سطح کا سطحی نام دے کر درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ دراصل سطح سامنے کی حقیقت ہے اور انسان سامنے کی حقیقت سے فائدہ تو پورا پورا اُٹھا لیتا ہے لیکن اُسے قدر کی نگاہوں سے دیکھنے کا بہت کم عادی ہے۔ پاس کا احساس دُور کے احساس کی نسبت زیادہ کٹھن ہوتا ہے۔

سطح ہمیں بہت دُور لے جا سکتی ہے بشرطیکہ ہم اُس سے غافل نہ ہوں۔ سطح سے غفلت کی سزا بے حسی ہے ـــ ہم عام طور پر جن لوگوں کو سطحی کہتے ہیں وہ اِسی غفلت کا شکار ہوا کرتے ہیں۔ سطح کی طرف توجہ کی جائے تو وہ سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتی ہے ـــ یہ سلسلہ ہر انسان کی ہمت کے مطابق ہوتا ہے۔ سطح انسان کا ظرف ہی نہیں اُس کا پیمانہ بھی ہے۔

انسان اپنے آپ کو سطح پر بہت کم محسوس کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس سے نیچا یا اونچا ہو جاتا ہے ـــ ہم اپنی روزانہ زندگی میں نہ سطح پر ہوتے ہیں اور نہ ہی بلندی یا گہرائی میں۔ بلکہ ایسے مقام پر ہوتے ہیں جو ہمارا اپنا تخلیق کردہ ہوتا ہے۔ ہم اس مقام کو مقامِ گُریز

کہہ سکتے ہیں۔ ہماری ذات یہ مقام اس لیے تخلیق کرتی ہے کہ اِسے اپنے آپ میں کون و مکان سے مقابلہ کرنے کی ہمّت نظر نہیں آتی۔ سطح کو محسوس کریں تو پوری کائنات کو محسوس کرنا پڑتا ہے۔ ہم مقابلہ کیے بغیر آفاق کو زیر کرنا چاہتے ہیں۔

تغیّر پذیری سطح کی بنیادی اور سب سے اہم خصوصیت ہے۔ جس نے اِس خصوصیت کو نہیں سمجھا، اُسے سطح کو ہاتھ تک لگانے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ ایک جگہ کھڑے ہوکر کوئی سطح کو ہاتھ نہیں لگا سکتا، سطح بھاگتی ہی نہیں راستے بھی بدلتی ہے۔ اسے ساکن یا سیدھی لکیر سمجھنے والا ہمیشہ فریب میں مبتلا رہتا ہے۔ دھوکے سے بچنے کے لیے سطح کو چھونا بہت ضروری ہے۔ ہاتھ لگ جائے تو سطح آدمی کو آسمانوں میں اُڑا کر لے جاتی ہے۔ اگرچہ روزمرہ زندگی میں سطح لوگوں کا اوڑھنا بچھونا ہوتی ہے لیکن وہ اُسے برائے نام بھی چھُونے کی کوشش نہیں کرتے۔ اِسی چھُونے اور نہ چھُونے پر انسانوں کے مقدر بنتے اور بگڑتے ہیں، جس نے سطح کو چھُو لیا اُس کی قسمت جاگ اُٹھی، جس نے نہ چھُوا وہ ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سو گیا۔

نادانی کا شعور

دُنیا میں نادانوں کا ہمیشہ قحط رہا ہے۔ جس طرح دانائی کہیں نہیں ملتی اور دانا ہر جگہ مل جاتے ہیں۔ اسی طرح نادان کہیں نہیں ملتے اور نادانی ہر جگہ مِل جاتی ہے۔ انسان خود کو دانا تو بلا تکلف سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن نادان سمجھنے کے لیے اُسے ہزار طرح کے کٹھن تجربات سے گزرنا پڑتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ناتجربہ کاری ہمیں دانا بنا کر بٹھا دیتی ہے اور تجربہ ہمیں ہمارے نادان ہونے کا احساس دلاتا ہے ——— علم ایک بے حد بوجھل شے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے تھوڑا سا حاصل کر کے بھی انسان خود کو بڑے بوجھ تلے محسوس کرتا ہے۔ یہاں کم و بیش کے مسئلہ کی ایک اور صورت قابلِ غور ہے۔ کسی چوہے کے ہاتھ ہلدی کی ایک گرہ آگئی تھی اُس نے اپنے آپ کو پنساری سمجھ لیا۔ یہ کہاوت طنز کے طور پر استعمال ہوتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں اگر چوہے کی نظر میں اتنی وسعت تھی کہ اُس نے ہلدی کی ایک گرہ میں پنساری کی پوری دکان کو دیکھ لیا تو کونسا گناہ کر دیا۔ لوگ تھوڑے کو بہت سمجھنا تنگ نظری خیال کرتے ہیں حالانکہ بہت کو تھوڑا سمجھنا بھی وسعتِ نظر کی دلیل نہیں ہے۔ سیر چشمی اشیاء سے بے تعلقی نہیں سکھاتی بلکہ اُن کے صحیح مقام سے آگاہ کرتی ہے۔ اِس آگاہی کی بدولت امکانات کے دروازے کھلتے ہیں اور امکانات کا احساس انسان کو کم و بیش کے خدشے

اور رُعب سے بلند کر دیتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم موجوداتِ عالم کی تعداد، مقدار اور صفات کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اِسی روّیے سے ہماری نادانی اور دانائی کا صحیح معیار بھی قائم ہوتا ہے۔

کائنات نہ ہے، نہ کبھی تھی اور نہ کبھی ہوگی۔ ہونے اور نہ ہونے کے درمیان ایک پردہ ہے۔ اصل میں اگر کوئی چیز وجود رکھتی ہے تو یہی پردہ ــــ لوگ عدم اور وجود کی بھُول بھُلیاں میں کھو جاتے ہیں، اِس پردے کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔ کائنات کے تمام تر اثبات کا انحصار اسی پر ہے۔ جس نے اِسے نہیں دیکھا اُس نے کچھ نہیں دیکھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جس نے اِس پردے کی حقیقت کو تسلیم نہیں کیا اُس نے کائنات کے وجود سے انکار کر دیا۔ (ظاہر ہے کہ منکرِ کائنات سے بڑا کافر کون ہو سکتا ہے) یہ پردہ کیا ہے ؟ آج اور کل کی درمیانی مدت۔ یہ مدت کیا ہے ؟ امکانات کے ظہور کا عرصہ ــ ہر لمحہ ایک پردہ اُٹھتا ہے اور امکانات کے سہارے کائنات وجود میں آتی رہتی ہے۔ وہ دانا جسے اپنے نادان ہونے کا یقین نہیں ہوتا کبھی اِس پردے کو اُٹھتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔

وجود کی لذّت نے انسان کے دل و دماغ کو اس طرح مسحور کیا ہوا ہے کہ وہ عدم کے بارے میں سوچنے کی سعی بھی کرے تو کچھ نہیں سوچ سکتا۔ خلق ہونے کے بعد پہلی سانس ہی اُسے ہستی کے ذائقے سے اس بھرپور انداز میں آگاہ کرتی ہے کہ پھر وہ اس آگاہی سے دم بھر کے لیے جُدا ہونا گوارا نہیں کرتا۔ اب اُسے کوئی لاکھ سمجھائے کہ میاں "ہونے" کی لذّت کے علاوہ "نہ ہونے" کی بھی ایک لذّت ہے اور وہ اس "ہونے" کی لذّت سے کہیں زیادہ وسعت و انبساط کی حامل ہے، لیکن انسان اسے ہرگز تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ہستی کو ثابت کرنے کیلیے وہ طرح طرح کے دلائل پیش کرتا ہے۔ طرح طرح سے ذہن کو بقائے دوام کا یقین دلاتا ہے۔ بقائے دوام بُری چیز نہیں، لیکن جب ہونے کی لذّت نہ ہونے کے

احساس کو فنا کرنے لگے تو پھر ارتقائے ہستی کا رُک جانا یقینی ہے۔ اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ ہستی کا ارتقا رُک جائے تو نظامِ حیات میں خلل واقع ہو جاتا ہے (عام طور پر افراد کی زندگیاں اسی خلل کا شکار ہو کر بے نام و نشان رہ جاتی ہیں) انسان کو ہوش سنبھالتے ہی اپنی دانائی کا احساس ہو جاتا ہے کیونکہ دانائی کا احساس وجود کی لذّت سے بہرہ یاب ہونے میں مدد کرتا ہے، لیکن اپنی نادانی کا احساس نہیں ہوتا۔ دراصل نادانی کا احساس دانائی کے احساس سے بہت بعد کی چیز ہے بالکل اسی طرح جیسے نہ ہونے کا احساس ہونے کے احساس سے بہت بعد کی بات ہے۔

جو کچھ ہو چکا ہے اُس کی مثال ایک ذرّہ سے بھی کم دی جا سکتی ہے، اُس کے مقابلے میں جو کچھ کہ ابھی نہیں ہوا۔ گویا وجود کے مقابلہ میں عدم کا پلّہ بھاری ہے۔ لیکن عدم کے اِس حقیقت افروز احساس کو انسان اُس وقت تک اپنی گرفت میں نہیں لا سکتا جب تک اُسے اپنی نادانی کا شعور نہیں ہو جاتا۔

انسان نادان پیدا نہیں ہوتا، نادان مرتا ہے۔ پیدائش کے وقت فطرت اُسے اتنا کچھ بتا دیتی ہے جتنا کچھ اُسے جاننے کی ضرورت ہے۔ آگاہی اور بے خبری کا سوال تو اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتا ہے۔ اسی لیے نادانی کا تعلق بچپن سے کم اور بلوغت سے زیادہ ہے۔

بچوں کو نادان کہہ کر ہم اپنی نادانی کا اظہار کرتے ہیں، ورنہ بالغ ہونے سے قبل انسان کو نادانی کی ہوا تک نہیں لگتی۔ دُنیا کو سطحی طور پر دیکھنے والے اشخاص کے لیے عالم اور دانا بن جانا آسان ہے لیکن جو لوگ سطح سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں ہمیشہ نادان رہتے ہیں۔ بچپن سطحوں سے کھیلنے کے زمانے کو کہتے ہیں اور شباب سطحوں کو توڑنے کی قوت کا نام ہے۔

بڑھاپے میں آ کر انسان ہر شے کی بیکرانی کے تصوّر سے لطف اندوز ہوتا ہے، جسے اخیر وقت میں بھی نادانی نصیب نہ ہو اُس کی بدقسمتی پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ نادانی کے شعور کے ساتھ زندگی کی صداقتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ اگر کسی کو عمر میں ایک بار بھی اپنے نادان ہونے کا احساس ہو گیا تو سمجھ لیجیے وہ کبھی زندگی کی تنگ دامانی کا شکوہ نہ کرے گا۔

نادانی زندگی کے ساتھ ساتھ قدم اُٹھاتی ہے لیکن لوگوں کو اُس کا احساس کیوں نہیں ہوتا؟ وہ ہمیشہ دانائی کے بوجھ تلے کیوں دبے رہتے ہیں؟ انھیں اپنی گردن میں علمیت کا جُوا ڈال کر کیوں خوشی ہوتی ہے؟ وہ نادانی کی لطافتوں میں کیوں نہیں کھو جاتے؟ ان تمام سوالات کا جواب یہ ہے کہ انسان جس چیز کو زیادہ پسند کرتا ہے اُسی سے وہ زیادہ خائف بھی رہتا ہے۔ لہٰذا اُسے جب اپنی پسند کی یہ چیز تھوڑی مقدار میں دستیاب ہوتی ہے تو وہ اُسے بہت سمجھ کر سینے سے لگا لیتا ہے۔ زیادہ حاصل کرتے ہوئے اس لیے ہچکچاتا ہے کہ اوّل تو اس میں محنت درکار ہے۔ دوسرے یہ خدشہ رہتا ہے کہ کہیں ساری کے پیچھے دوڑنے میں آدھی بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے، ہاتھ سے نکل جانے کا یہی خدشہ تھوڑی چیز کو بہت بنا دیتا ہے۔ چنانچہ انسان بہت کچھ جاننا چاہتا ہے لیکن جب اُسے بہت کچھ کے بجائے صرف کچھ کا علم ہوتا ہے تو وہ اُسی علم کو بہت سمجھتے ہوئے علمیت کے مستقل فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نادانی کے شعور کی پہلی ضرب اسی فریب پر آ کر پڑتی ہے۔ یہ شعور انسان کو بتاتا ہے کہ اب تک جو کچھ اُسے علم حاصل ہوا ہے اُس کی حیثیت نہایت معمولی ہے، ابھی اُسے بہت کچھ معلوم کرنا ہے۔ جیسے جیسے علم بڑھتا ہے نادانی کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا چلا جاتا ہے اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ سب سے بڑا دانا سب سے بڑا نادان ہوتا ہے۔

انسان کے ہاں جس احساس کی بے حد فراوانی ہے وہ دانائی کا احساس ہے۔ کون

ہے جو اپنے آپ کو دانا نہیں سمجھتا ہ علم و دانش تو جیسے انسان کی گھٹی میں پڑے ہیں۔اس حساب سے اگر دانائی کی قیمت لگائی جائے تو شاید کوئی اُسے کوڑیوں کے مول بھی لینے کو تیار نہ ہو۔ آخر دانائی کے نرخ میں گرانی کی ضرورت بھی کیوں پیش آئے ہ یہاں تو جسے دیکھو وہی دانائے روزگار نظر آتا ہے۔"میں کچھ جانتا ہوں" ہر شخص کہہ سکتا ہے۔"میں کچھ نہیں جانتا" ہر شخص نہیں کہہ سکتا۔کچھ نہیں جاننے کا اعتراف وہی شخص کرسکتا ہے جس نے جاننے کی بہت سی کڑی منزلیں طے کی ہوتی ہیں۔بہت کچھ جان کر کچھ نہ جاننے کا اظہار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ علم و آگاہی کے لامتناہی سلسلوں کو محسوس کر لیا گیا ہے۔گویا کچھ نہ جاننے کا اظہار کرنے والا شخص کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلۂ امکانات پر یقین رکھتا ہے۔

علم اور نادانی ہم رکاب رہیں تو آگہی کا سفر دل چسپ ہو جاتا ہے اور مسافر کو تھکن محسوس نہیں ہوتی۔اس کے علاوہ اِس ہم سفری کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ غرور کو حائل ہونے کا موقعہ بیسّر نہیں آتا جس کے باعث بہت سے کٹھن مرحلے خود بخود طے ہو جاتے ہیں لیکن علم اور نادانی کو یکجا محسوس کرنا آسان بات نہیں ہے۔علم ایک حاصل کی ہوئی چیز ہے اور نادانی جسے ابھی حاصل نہیں کیا جاسکا۔ایک چیز ہماری خودی کو تسکین پہنچاتی ہے اور دوسری اُس پر کاری ضرب لگاتی ہے۔اِسی لیے انسان خود کو نادان محسوس کرنے میں تامّل سے کام لیتا ہے۔نادانی کو سمندِ شوق کے لیے تازیانہ خیال کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

علم چونکہ طاقت ہے اس لیے ایک نشّہ بھی ہے اور زہر بھی۔نادانی کا شعور اس طاقت کے نشّے اور زہر کو موقع و محل کے مطابق بروئے کار لاتا ہے ـــــ مطلب یہ ہے کہ علم کے بوجھ کو برداشت کرنے کی قوّت نادانی کے گرانقدر اعتراف کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ یہ اعتراف انسان کے ظرف کو عالی کرتا ہے۔اُس میں وسعتیں بھرتا ہے۔اور اُس کی قدر و قیمت

میں بے پناہ اضافوں کا باعث بنتا ہے۔ جو افراد مسلسل علم حاصل کرنے کے باوجود اپنے نادان ہونے پر اصرار کرتے رہتے ہیں۔ اُن کے لیے زندگی ایک ایسے اُبلتے ہوئے چشمے سے مشابہت رکھتی ہے جس کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے۔
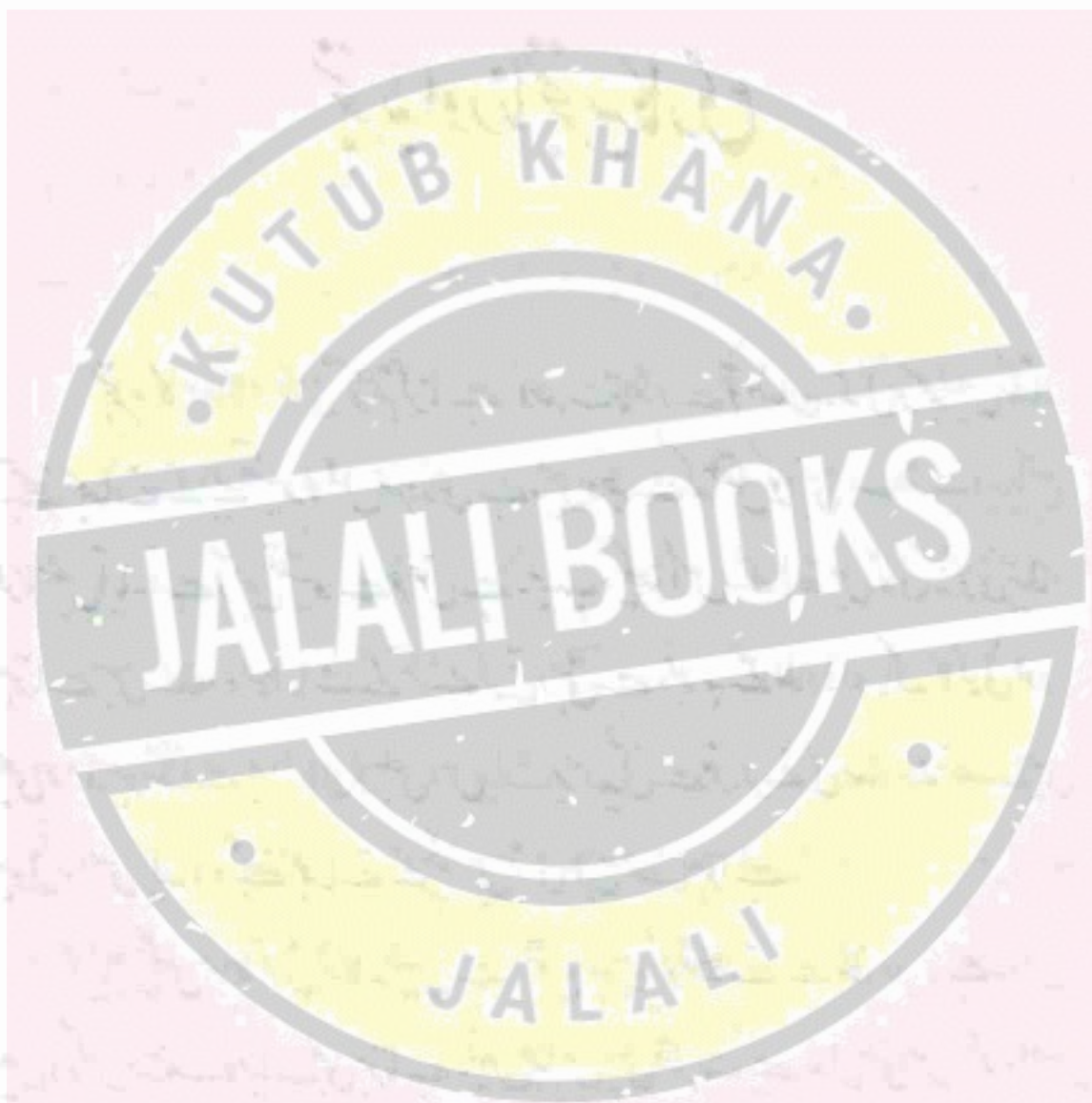
تجربہ اور ناتجربہ کاری

تجربہ کا پہلا کام اکائی کو ختم کرنا ہے۔ وحدت قائم رہے تو انسان زندگی کو سمجھ نہیں سکتا۔ سمجھنے سمجھانے کے لیے تقسیم کا عمل ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل کو ابھی تک ضرب دینا یا جمع کرنا نہیں آیا۔ اُسے تو بس تقسیم سے غرض ہے۔ جب دیکھو اُس کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی تیغا ہوتا ہے جس سے وہ موجودات کے ٹکڑے کرتی رہتی ہے۔ تجربہ کے علاوہ ادراک کا کوئی اور بھی طریقہ ہو سکتا ہے؟ انسان کو ابھی اِس بات پر سنجیدگی سے غور کرنے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ اسی لیے وہ سمجھنے سمجھانے کے چکر میں بُری طرح پھنسا ہوا ہے۔

دُنیا میں کسی چیز کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ تجربہ ہر چیز کو ٹھکانے سے لگانا چاہتا ہے۔ اِس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا ہے۔ لیکن چیزیں اپنی فطرت کیسے بدل سکتی ہیں۔ تجربہ اُنھیں ہزار باندھ کر بٹھائے وہ کبھی نہ کبھی یہ سارے بندھن توڑ کر اُس کی گرفت سے نکل بھاگتی ہیں۔ حدود کا تمام تصور تجربہ کی پیداوار ہے۔ جب حدیں ٹوٹتی ہیں تو تجربہ اپنی شرمندگی دُور کرنے کے لیے یہ کہتا ہے کہ حدیں نہیں ٹوٹیں، میرے قدم آگے بڑھے ہیں۔

تجربہ کے ذریعے بات سمجھنا آسان ہے۔ اِس لیے نہیں کہ تجربہ خود آسان چیز ہے بلکہ

اس لیے کہ تجربہ کے ذریعہ بات ہمیشہ ادھوری سمجھ میں آتی ہے (ظاہر ہے کہ کچھ سمجھنا سب کچھ سمجھنے کی نسبت آسان ہوتا ہے) انسان کو اچھے بُرے کی تمیز بھی اسی ادھورے پن کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ جتنا کچھ سمجھ میں آگیا وہ اچھا، جو سمجھ میں نہیں آیا وہ بُرا ـــ امتیازات کا بیشتر حصہ سمجھ اور ناسمجھی کی اسی درمیانی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔

آدمی میں کمال کو سمجھنے کی بے پناہ خواہش ہے۔ لیکن اس کارِ عظیم کے لیے اُس نے جو ذریعہ اختیار کیا ہے وہ سخت خطرناک ہے یعنی نقص کی منزلوں کا سفر۔ انگلی پکڑ کر پہنچا پکڑنے والی بات بظاہر نہایت معقول معلوم ہوتی ہے لیکن عام طور پر حادثہ یہ پیش آتا ہے کہ آدمی انگلی کے لمس کی کیفیت ہی میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ نہ صرف اُسے پہنچا پکڑنے کا خیال نہیں رہتا بلکہ وہ انگلی ہی کو پہنچا سمجھ لیتا ہے۔ یہی پہنچا پکڑنے کی خواہش یعنی حصولِ کمال کی خواہش ناتجربہ کاری ہے اور انگلی پکڑ کر پہنچا پکڑنے کی ناکام کوشش، تجربہ ـــ

میں سعیٔ لاحاصل کا قائل نہیں ہوں۔ کوشش خواہ کسی قسم کی ہو رائگاں نہیں جاتی ـــ تجربہ ہزار خطراتِ نقص کے باوجود اپنے دامن میں منفعتیں بھی رکھتا ہے، خصوصاً مادّہ کو مسخر کرنے کے لیے نقص کی منزلوں سے تجربہ کا سفر بے حد سودمند ثابت ہوا ہے۔ یعنی دُنیاداری کا سامان مہیا کرنے میں تمام کا تمام تجربہ کا ہاتھ ہے۔ لیکن دُنیادار بنا کر تجربہ نے انسان میں کونسی صفات پیدا کیے، اِس تلخ حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

تجربہ سے پہلے انسان یگانگت کی فضا میں سانس لیتا ہے۔ کائنات اُس کی مُٹھی میں ہوتی ہے۔ اِس اعتبار سے نہیں کہ کائنات کوئی مُٹھی میں آنے والی شے ہے؛ بلکہ اِس اعتبار سے کہ وہ اپنی مُٹھی اور کائنات کو دو الگ چیزیں تصوّر نہیں کرتا۔ نہ آگ اُسے جلاتی ہے، نہ پانی اُسے ڈبوتا ہے۔ سب تک پہنچنا اور سب کو اپنے تک لے آنا اُسے نہایت آسان اور سہل نظر

آتا ہے۔ اُس کے راستے میں دیواریں حائل نہیں ہوتیں اور اگر ہوتی ہیں تو اُسے یقین ہوتا ہے کہ جب وہ سفر کا آغاز کرے گا یہ خود بخود اُس کے لیے راستہ بنا دیں گی۔ دراصل ناتجربہ کاری کی فضا دوستی کی فضا ہے۔ اِس میں انسان کو سب اپنے دکھائی دیتے ہیں کوئی غیر نظر نہیں آتا۔ تجربہ سب سے پہلے اسی دوستی کی فضا کو مجروح کرتا ہے۔ نفع اور نقصان، اپنے اور پرائے کی تمیز اُس کا اوّلین عطیّہ ہے۔ آفاقیت اور ہمہ گیری تجربہ سے پہلے کی باتیں ہیں۔ ہر ایک کو اچھا سمجھنا، ہر ایک سے محبّت کرنا، انسان کی ناتجربہ کاری کو ظاہر کرتا ہے۔ اِسی طرح انصاف پسندی، غیر جانبداری، خیر خواہی اور ہمدردی وغیرہ قسم کے صفات بھی انسان کو تجربہ کی بنا پر حاصل نہیں ہوئے۔ ان میں بھی اُس کی ناتجربہ کاری پُکار پُکار کر اپنا اعلان کر رہی ہے۔

میں نگاہ کی وسعت اور دِل کی کُشادگی کو خوب یا ناخوب نہیں کہتا۔ ہو سکتا ہے جسے ہم وسعت کہتے ہیں وہ خلاؤں میں بلا مقصد ہاتھ پاؤں مارنے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ یا ممکن ہے وسعت کے تصوّر میں انسان محسوس حقائق کے فشار سے تنگ آ کر جائے فرار تلاش کرنا چاہتا ہو۔۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وسعت ہی وہ مقصدِ عظیم ہو جس کے لیے انسان کی ہستی وجود میں آئی ہے۔ اِسی طرح انصاف پسندی، غیر جانبداری، ہمدردی اور خیر اندیشی وغیرہ کے خوب و ناخوب ہونے کے بارے میں کوئی قطعی حکم لگانا مناسب نہیں ۔۔۔ انصاف پسندی میں اگر پُوری طرح نہیں تو پچاس فیصد انسان اپنے آپ سے قطعِ تعلق ضرور کر لیتا ہے۔ گویا نفسا نفسی کو چھوڑ کر نصفا نصفی کی فضا میں معلق ہو جاتا ہے۔ نہ وہ خود سے پیار کرتا ہے، نہ کسی دوسرے سے۔ نہ اُسے خود سے نفرت ہوتی ہے نہ کسی غیر سے۔ وہ تو بس انصاف کے پیچھے بھاگتا ہے جو اُسے کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ (یہ اور بات ہے کہ انسان کہیں کا نہ رہ کر ہی زیادہ خوش رہتا ہو) ۔۔۔ انصاف پسندی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ انسان کو اُس کی ذات تک محدود نہیں رہنے دیتی بلکہ پُورے عالمِ انسانیت تک اُس کی

ہستی کو لے جانا چاہتی ہے۔ وہی وسعت کا پیغام، وسعت کی دعوت، وسعت کی طرف قدم بڑھانے کی ترغیب ــــ غیر جانبداری کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ غیر جانب دار آدمی بھی کسی کا نہ ہوتے ہوئے سب کا ہوتا ہے۔ یہاں بھی وسعتیں اپنا دامن پھیلائے موجود ہوتی ہیں اور نوبہ نو فضاؤں کی آغوش کشادہ لیکن اس کے ساتھ ساتھ خلا بھی منھ پھاڑ کر چنگھاڑتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ ہمدردی اور خیر اندیشی وغیرہ کا یہ حال ہے کہ ہمدردی میں انسان کبھی درد سے بالکل رشتہ توڑ بیٹھتا ہے اور کبھی سراپا درد بن جاتا ہے۔ خیر اندیشی میں کبھی اپنے ساتھ دوسروں کو بھی پار لگا دیتا ہے اور کبھی نہ صرف اپنا بلکہ سب کا بیڑہ غرق کر بیٹھتا ہے۔ غرض جملہ اعلیٰ انسانی قدریں جن کے مثبت اور منفی ہر دو پہلوؤں پر بحث کی جا سکتی ہے اور جن پر انسانیت کو ہمیشہ ناز رہا ہے۔ انسان کے تجربہ کی نہیں بلکہ ناتجربہ کاری کی پیداوار ہیں۔ اِن اقدار کے فروغ میں اگر تجربہ کا کوئی ہاتھ ہے تو صرف اتنا کہ اُس نے اِن کے مقابلہ میں ایک بار نہیں سینکڑوں بار شکست کھائی ہے (حالانکہ وہ اپنی ضد پر ہمیشہ قائم رہا ہے اور ہے)۔

تجربہ انسان کو خود غرض، حریص، ڈرپوک، متعصّب، تنگ دِل اور تنگ نظر بنا دیتا ہے۔ میں اِن صفات کو بھی کُلّی طور پر بُرا نہیں سمجھتا۔ نالائق اولاد اور کھوٹے پیسہ کی طرح یہ صفات بھی کسی نہ کسی موقعہ پر انسان کے بُرے وقت میں کام آ ہی جاتے ہیں۔ یوں بھی خود غرضی اور لالچ ایک خاص حد سے تجاوز نہ کریں تو آدمی کو زندگی میں خاصی عافیت نصیب ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح بعض حالات میں خوف اور تعصّب کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ کبھی کبھی تنگ دلی اور تنگ نظری کی بدولت بھی انسان کو زندگی کا ایک شدید اور گہرا شعور حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن عام طور پر جو بڑی دشواری پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ تجربہ اپنی قائم کی ہوئی حدوں کا اعلان جس قطعیت کے ساتھ کرتا ہے اُس میں اُس کا یقین جہالت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ زندگی کو

قطعیت ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ خصوصاً انسانی معاملات میں اِس سے بڑھ کر خطرناک شے اور کوئی نہیں ہے۔

ہم دیگر اشیا کے برتاؤ اور طرزِ عمل کے بارے میں قبل از وقت کوئی حکم لگا سکتے ہیں، لیکن کسی انسان کے برتاؤ اور طرزِ عمل سے متعلق ایسا نہیں کر سکتے۔ اگرچہ شاذونادر اشیا بھی اس قید سے آزاد ہو جاتی ہیں اور انسان بھی عموماً توقع کے مطابق ہی عمل کرتا ہے لیکن پھر بھی انسانی طرزِ عمل پر کامل وثوق کے ساتھ پیشین گوئی کرنا محال ہے۔ ایک جھوٹے آدمی سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ہمیشہ جھوٹ بولے گا سراسر غلط ہے۔ اسی طرح ایک سچ بولنے والے سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ہمیشہ سچ بولے گا، یہ بھی درست نہیں۔ بھلا آدمی کب بُرائی کر بیٹھتا ہے اور بُرے آدمی سے کب بھلائی ہو جاتی ہے، اس ضمن میں یقینی طور پر کچھ کہنا آسان نہیں، البتہ امکانات سو فی صد موجود ہوتے ہیں۔ تجربہ کی سب سے بڑی جہالت یہی ہے کہ وہ خود اعتمادی کے زعم میں ان امکانات کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔

دیگر موجوداتِ عالم اور انسان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ دوسری چیزوں کو تقسیم کیا جاسکتا ہے، انسان کی حدبندی نہیں کی جاسکتی۔ ہزار ٹکڑے کرنے کے باوجود اس کی وحدت برقرار رہتی ہے۔ دیگر اشیا کی ذات کا پتہ چل جاتا ہے۔ انسان کی ذات کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ یہ طرح طرح کے رُوپ دھار کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اختلاف اور تضاد اس کی اصلیت پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ فی الحقیقت وہ کیا ہے؟ یہ ایک راز ہی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کی اکثریت خلق تو ہو جاتی ہے لیکن ظاہر نہیں ہوتی۔ دوسرے موجودات کی طرح تجربہ انسان کو بھی محدود کر کے اُس پر حرفِ آخر صادر کرنا چاہتا ہے۔ تجربہ کی حدیں دیگر اشیاءِ عالم کے ضمن میں تو یقیناً کارآمد ثابت ہوتی ہیں لیکن انسان کو اِن حدود کے حصار میں

لینے کی کوشش کرنا فائدہ سے زیادہ نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ اشیا کو تعصّب کی نظر سے دیکھنا، اُن سے خوف کھانا، اُن کے بارے میں تنگ نظری سے کام لینا یہ سب باتیں نہ صرف اشیاء کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں بلکہ کائنات پر انسان کی گرفت کو مضبوط بھی کرتی ہیں لیکن انسانی معاملات میں یہی باتیں جہل، بُعد اور ہلاکت کا سبب بن جاتی ہیں۔ انسان سے انسان کا تعصّب اور انسان سے انسان کا خوف ہمیشہ ایک دوسرے کے درمیان بیگانگی کی خلیج حائل رکھتا ہے۔ دراصل انسان کو سمجھنے کے لیے عصبیت، خوف اور تنگ نظری وغیرہ قسم کی قیود کو توڑے بغیر چارۂ کار نہیں۔ یہ دیواریں تجربہ نے عناصرِ اربعہ کو قابو میں کرنے کی خاطر اُن کے گرد کھڑی کی تھیں بعد میں اُس نے انسان کو بھی آگ، پانی، مٹی اور ہوا سمجھ کر گھیرے میں لینے کی کوشش جاری کر دی اور یوں آدمی کائنات کو تسخیر کرتے کرتے اپنے آپ سے بے خبر ہوتا چلا گیا۔ انسانی تہذیب و تمدن کے سینہ پر تجربہ کی یہ کوشش ایک ناسُور بن کر رہ گئی۔

عموماً تجربہ تکلیفیں پہنچاتا ہے۔ زخم لگاتا ہے۔ ناتجربہ کاری اِن زخموں پر پھاہے رکھتی ہے۔ تجربہ کی لذتوں اور مسرتوں کے پیچھے بھی ناتجربہ کاری ہی کا نرم و نازک ہاتھ ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو کوئی تجربہ کرنے کا خیال تک دِل میں نہ لائے۔ انسان جس جذبے کے تحت کائنات کو ٹکڑوں میں تقسیم کرتا چلا جاتا ہے، اُسی جذبے کے تحت اُس کے دل میں کائنات کو ایک مکمل صورت میں دیکھنے کی خواہش بھی پیدا ہوتی ہے۔ اجزا کا مشاہدہ اُس کے ذوقِ جستجو کی تسکین ہی کا باعث نہیں بنتا اُسے بے حد دُکھ بھی پہنچاتا ہے، اِسی لیے وہ بار بار کُل کی طرف دوڑتا ہے۔ انسانی ارتقا کے سارے مراحل اسی مراجعت کی بدولت طے ہوئے ہیں۔ کُل ہاتھ سے نکلنے کے باوجود ہاتھ سے نہیں نکلتا۔

جزو کا تصوّر موت کی خبر دیتا ہے۔ کُل کا خیال یہ بتاتا ہے کہ موت کے بعد پھر زندگی ہے۔

موت اور زندگی کے اِسی جھمیلے میں انسان جزو سے کُل اور کُل سے جزو کی طرف سفر کرتا رہتا ہے ۔ اور اِس سفر میں قدم پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے زیادہ بڑھتے ہیں ۔

تجربہ نہ ہوتا تو انسان کبھی نہ مرتا ۔ یا کم از کم وہ موت کے تصور سے کبھی آگاہ نہ ہوتا ابھی تک تجربہ کی سب سے بڑی دریافت موت ہی ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موت کی دریافت نے کائنات کے بہت سے راز منکشف کیے لیکن انسان کو زندگی کے بھید معلوم کرنے سے بیگانہ کر دیا ۔۔۔ وہ زندگی سے زیادہ موت کا سُراغ لگانے میں مصروف ہوگیا ۔۔۔ ایسی چیز کا سراغ جس کی فی الواقع کوئی حقیقت نہیں ہے ۔ ہمارے ہر خیال اور ہر کوشش کے پسِ منظر موت کا تصوّر کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوتا ہے ۔ خواہ اِسے لاشعوری طور پر کہہ لیجیے ، ہم زندگی کی نسبت موت پر زیادہ سنجیدگی سے غور کرنے کے عادی ہیں ۔ انسان حقائق سے مُنہ اُسی وقت موڑتا ہے جب اُسے اُن کے پیچھے کچھ نظر نہیں آتا ۔ کچھ نظر نہ آنا ہی موت ہے ۔ انسانی فطرت ہر حقیقت کے عقب میں ایک حقیقت دیکھنے کی متمنی ہے ۔ تجربہ انسان کی اِس تمنا کو گلا گھونٹ کر ختم کرنا چاہتا ہے ۔ تجربہ کی کم مائگی اور کوتاہ نظری ظاہر ہے ۔ اس کوتاہ نظری کی وجہ سے ہم زندگی کو گندراں اور موت کو اٹل خیال کرنے لگے ہیں ۔

ناتجربہ کاری امیدوں اور آرزؤں کا مسکن ہے ۔ اُس میں انسان کو زمان و مکان کے اثرات سے اونچا اُٹھا لینے کی بے پناہ قوت موجود ہے ۔ وہ اُسے (یعنی انسان کو) ہمیشہ بچپن یا زیادہ سے زیادہ جوانی کی حدوں میں رکھتی ہے ۔ تجربہ انسان کو بوڑھا کر دیتا ہے ۔ اُس کے چہرے پر جھُرّیاں ڈال دیتا ہے ۔ اُس کی صورت بگاڑ دیتا ہے ۔ دراصل انسان نے تجربہ پر غلبہ حاصل نہیں کیا ، بلکہ تجربہ نے انسان کو اپنے شکنجہ میں لے لیا ۔

تجربہ کی اس مضبوط اور ہلاک کر دینے والی گرفت سے بچنے کا صرف ایک طریقہ ہے ،

اور وہ یہ ہے کہ ناتجربہ کاری کی قوت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جائے۔ ناتجربہ کاری کی اِس قوت کا دوسرا نام محبت ہے۔ محبت کرنے والے تجربہ کار ہو کر بھی ناتجربہ کار رہتے ہیں اور یوں اُن کے ہاتھ سے کُل کا دامن کبھی نہیں چھوٹتا۔

کسبِ زر
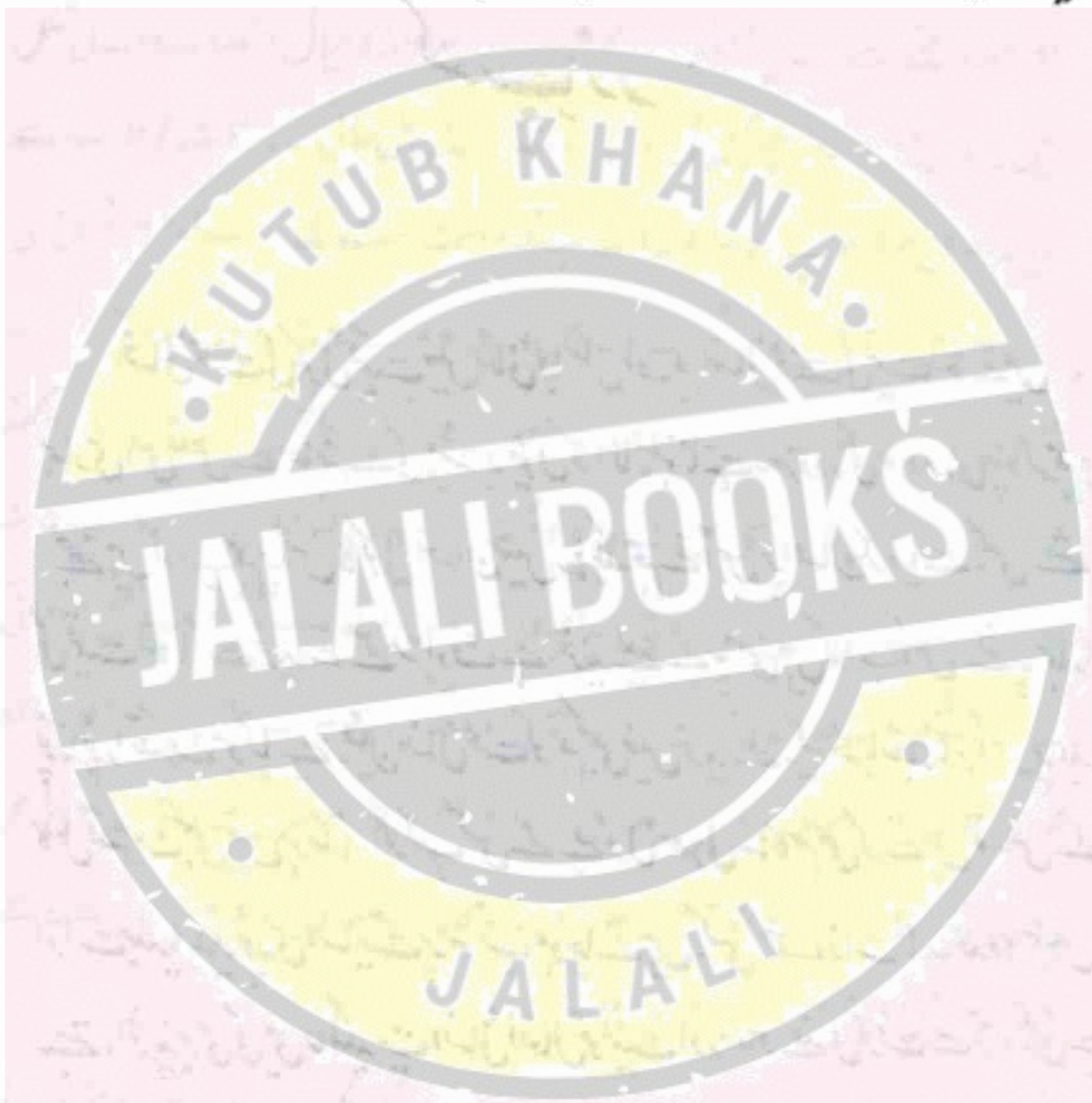
انسانی محنت کی کوئی قیمت نہیں لگائی جاسکتی اور ہم انسانی محنت کی قیمت لگاتے ہیں۔ ہماری اسی غلطی سے معاشرے کی بیشتر برائیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ مزدور کی مزدوری چکا کر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اب ہم پر اُس کا کوئی احسان نہیں رہا بلکہ ہم نے اُس پر احسان کر دیا ہے۔ کسی شے کی قیمت لگانا اُسے خریدنے کے مترادف ہے۔ خرید لینے کے یہ معنی ہیں کہ اب اُس شے پر ہمارا پُورا پُورا تصرف ہو گیا ہے۔ لیکن انسانی محنت کو ہم کبھی نہیں خرید سکتے۔ کیونکہ باعتبار تاثر اُس پر ہمارا کامل تصرف کبھی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ کسی کے لیے کوئی معمولی سا کام بھی کرتے ہیں تو اُس کے اثرات جلد یا بدیر پُوری انسانیت پر مترتب ہو جاتے ہیں، کسی ایک ذات تک محدود نہیں رہتے۔ اثر پذیری کی یہی عالمگیریت انسانی افعال کو قیمت اور معاوضے کی گرفت سے آزاد رکھتی ہے۔ مزدور کی مزدوری اُس کی محنت کا صلہ نہیں ہوتا، اظہارِ تشکر کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ہم کسی کے شکر گزار اس لیے ہوتے ہیں تاکہ وہ ہمارے لیے اپنے احسانات کا سلسلہ جاری رکھے۔ شکر گزاری میں عزت و احترام کی نسبت مزید احسان کی توقع زیادہ شامل ہوتی ہے۔ ویسے کام کرنے والا کام لینے والے سے ہر حال میں برتر ہوتا ہے۔ لیکن ہم اس برتری کو عموماً تسلیم نہیں کرتے۔

ہمارے اسی انکار نے انسانی محنت کو قیمت اور معاوضے کے تصوّر سے آشنا کیا۔ اگر ہم ہر چھوٹے اور بڑے کام کرنے والے کی برتری کو تسلیم کر لیں تو ہم میں احسامندی کا ایسا بلند مرتبت جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کی بدولت ایک اعلیٰ انسانی معاشرے کی تشکیل بہت آسان ہو جاتی ہے ــــ محنت انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ ہر انسان محنت کرنا چاہتا ہے، لیکن قیمت اور معاوضے سے بے نیاز ہو کر ــــ محنت میں اگر معاوضہ کا خیال (خصوصاً دولت کی شکل میں)، شامل ہو جائے تو پھر اُس کی ساری لذت خاک میں مل جاتی ہے۔ محنت کو دولت سے ایک خاص قسم کا بیر ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ دولت محنت کے سامنے اکثر سپر ڈال دیتی ہے اور اُس کے پاؤں پڑ جاتی ہے) انسان اپنے کام کے صلے میں شاید دنیا کی معمولی سے معمولی چیز قبول کر جائے لیکن وہ دولت کو بطور معاوضہ قبول کرنا کبھی گوارا نہیں کرتا۔ وہ سمجھتا ہے دولت پر اُس کا پیدائشی حق ہے۔ وہ تو اُسے ہر حال میں ملنا چاہیے۔ محنت سے دولت کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ تعلق پیدا ہو جائے تو نہ صرف محنت کی صورت مسخ ہو جاتی ہے، بلکہ اُس سے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ سچّا مزدور معاوضے کا کبھی طلبگار نہیں ہوتا اور جھوٹی مزدوری مزدوری نہیں ہوتی، غلامی ہوتی ہے ــــ دنیا میں بہت سے لوگ اس لیے بھی سہل انگار اور کام چور ہو جاتے ہیں کہ انھیں معاوضے سے بے نیاز ہو کر محنت کرنے کا موقعہ میسّر نہیں آتا۔

دولت مندی اور مفلسی دو متضاد چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی تصویر کی دو بگڑی ہوئی صورتیں ہیں۔ جس طرح افلاس انسان کو تباہ و برباد کر سکتا ہے اور کر دیتا ہے اسی طرح امارت بھی انسان کی ہلاکت کا باعث بن سکتی ہے اور بن جایا کرتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مفلسی میں انسان کو یہ احساس رہتا ہے کہ وہ ہلاک ہو رہا ہے اور اُس کی موت قریب

ہے، دولت مندی میں وہ اس احساس سے محروم ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دل کی گہرائیوں میں اُتر کر دیکھا جائے تو کوئی انسان نہ دولت مند ہونا چاہتا ہے اور نہ مفلس۔ تموّل ہو یا افلاس دونوں حالتوں میں اُس کی انسانیت خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ اُسے یہ اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ غریب یا امیر ہو کر وہ انسانیت کے بلند مقام تک نہیں پہنچ سکتا، چنانچہ جس طرح وہ افلاس کو مجبور ہو کر قبول کرتا ہے اسی طرح اُس کے دولت مند ہونے میں بھی کسی نہ کسی نوع کی مجبوری شامل ہوتی ہے۔ امارت یا غربت میں انسانی اختیار کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اختیار کا سب سے بڑا کرشمہ تو یہ ہے کہ وہ انسان کو محنت اور مشقت کی عظمتوں سے آشنا کر دیتا ہے۔ کسی کو جس قدر اپنے صاحب اختیار ہونے کا احساس ہوتا ہے، اُسی قدر وہ محنت سے کام کرتا ہے۔ بااختیار لوگ خود کو عیش و آرام میں گم نہیں کر لیتے بلکہ خلوص کے ساتھ محنت کرنا اُن کی زندگی کا شعار بن جاتا ہے۔

اگر یہ بات ہے تو پھر انسانی معاشرہ میں امارت اور غربت نے کیسے جنم لیا؟ اس کا جواب جیسا کہ عام طور پر دیا جاتا ہے، یہ نہیں ہے کہ جن لوگوں نے محنت کی وہ دولت مند ہو گئے اور جنہوں نے محنت نہیں کی اُن کو غربت نے آگھیرا۔ جس طرح دولت مند ہونے کے لیے محنت ضروری نہیں اسی طرح محض تن آسانی کو افلاس کا سبب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عموماً امیر لوگ راحت پسند اور غریب جفاکش ہوا کرتے ہیں۔ دولت مندی یا افلاس کا دارومدار محنت پر نہیں ہے۔ محنت انسان کو نہ دولت مند بناتی ہے اور نہ مفلس۔ یہ تو اُس کو جینا سکھاتی ہے۔ اُس کی زندگی کو چار چاند لگاتی ہے، حیات و کائنات پر اُس کی گرفت کو مضبوط کرتی ہے، اُس پر بقا کے راز کھولتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محنت انسان کو انسان بناتی ہے، امیر یا غریب نہیں بناتی — امارت یا غربت کا سوال تو اُس وقت پیدا ہوتا ہے، جب انسان اپنے دوسرے ہم جنسوں کی محنت کو خریدنا چاہتا ہے

اور اس عظیم حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے لیے جو کچھ بھی کرتا ہے وہ ایک احسان ہوتا ہے اور اُس کی کوئی قیمت نہیں چکائی جاسکتی۔ اگر ایک انسان دوسرے انسان کو عزّت کی نگاہ سے دیکھے اور اُس کی محنت کو بطور احسان قبول کرے تو دُنیا میں کوئی امیر یا غریب نہ رہے۔ دولت کی تقسیم میں ناانصافی اور افراط و تفریط کی اصل وجہ یہی ہے کہ ابھی تک انسان نے دوسرے انسانوں کی پُوری طرح عزّت کرنا اور اُن کی محنت کو بہ نظرِ استحسان دیکھنا نہیں سیکھا۔ اگر ہم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ہر انسان دوسرے انسان کا محسن ہے اور کسی کا احسامند ہونا کوئی ذلیل بات نہیں ہے بلکہ احسامندی سے حقیقی انسانی زندگی کا آغاز ہوتا ہے تو پھر ہمارے لیے دولت مقصد کا درجہ کبھی حاصل نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرے میں دولت مقصد کا درجہ نہیں رکھتی اُس کے افراد میں دولت کی تقسیم کا مسئلہ نہیں رہ جاتا۔ افراد خود بخود ایک دوسرے کی مدد کر کے بلحاظ دولت سب کو یکساں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں دوسروں کو اپنا مال و متاع بخش کر ایک خاص قسم کی مسرّت حاصل ہوتی ہے۔

یہ درست ہے کہ دولت اپنی جگہ گھٹیا چیز نہیں لیکن دولت کمانا یقیناً سب سے گھٹیا کام ہے۔ گالی دینے، جھُوٹ بولنے اور چوری کرنے سے شاید آدمی اتنا ذلیل نہ ہوتا ہو جتنا دولت کمانے پر لگ جانے سے ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ جسے بھی یہ مرض لاحق ہو جائے وہ دین کا رہتا ہے نہ دنیا کا اور اگر بالفرض محال اُس کا تھوڑا بہت رشتہ دنیا سے قائم بھی رہتا ہے تو اُس کی اپنی ذات کا حقیقی تعلق اُس سے بالکل ختم ہو جاتا ہے ۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ دولت کمانا اُن لوگوں کے لیے بہت آسان ہے جن کو اپنی عزّتِ نفس کا پاس نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جن لوگوں کو اپنا پاس ہوتا ہے وہ دنیا کا بڑے سے بڑا کٹھن کام کر سکتے ہیں لیکن دولت نہیں کما سکتے۔ دولت اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر کمائی جاتی ہے اور یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جسے اپنی قدر و منزلت کا احساس

نہیں ہوتا۔ واضح رہے کہ میں دولت کی برائی نہیں کر رہا ہوں اور نہ ہی یہ میرا مطلب ہے کہ انسان دولت سے محروم رہے۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دولت ہر انسان کے حصے میں آئے لیکن اُسے یعنی انسان کو محض دولت کے حصول کے لیے کسی قسم کی تگ و دو نہ کرنا پڑے۔ اُس کی محنت و مشقت کے پس منظر تو ہمیشہ کوئی ایسا مقصد کارفرما ہے جس کے بدولت زندگی کے راز منکشف ہوتے چلے جائیں اور انسانیت کا بول بالا ...... میں سمجھتا ہوں اسلام میں اللہ کے رزاق ہونے کا جو تصوّر موجود ہے اُس کے معنی بھی یہی ہیں کہ آدمی نان و نفقہ کی فکر سے آزاد ہو کر محنت کرے دولت اُسے خود بخود حاصل ہوگی۔ شاید دنیا میں صرف دولت ایک ایسی چیز ہے جو بذاتِ خود بُری نہیں لیکن اُس کو حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنا سب سے بُرا کام ہے۔ وہی بات کہ آدمی صرف دولت کمانے پر لگ جائے، تو اپنی حقیقی انسانی صلاحیتوں کو برباد کر لیتا ہے۔ دنیوی ساز و سامان کے باوجود اُس کا ذہن مفلس رہتا ہے۔ اُس کے فکر کی اڑان محدود ہو جاتی ہے۔ ہوس اُس کو زندگی کی بیشتر مسرّتوں سے محروم کر دیتی ہے۔ وہ سخت حریص اور تنگ نظر ہو جاتا ہے۔ غرض دولت کما کر انسان شاید سب کچھ پا لیتا ہو لیکن وہ اپنے آپ کو یقیناً اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھتا ہے۔

علاوہ ازیں دُنیا میں ہر چیز جائز طور پر کمائی جا سکتی ہے۔ لیکن آج تک دولت کمانے کا جائز طریقہ معلوم نہیں ہو سکا۔ دولت جب بھی کمائی گئی یا کمائی جاتی ہے، ناجائز طریقے سے کمائی جاتی ہے۔ دراصل دولت کمانے کے معنی ہیں دولت کو مقصدِ حیات بنانا۔ ظاہر ہے کہ دولت جب مقصدِ حیات بن جائے تو پھر اُس کے حصول کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ دولت کا مقصدِ حیات بننا انسانیت کی سب سے بڑی توہین ہے۔ دولت کمانے والے کی نظر میں حقیر سے حقیر چیز کی کوئی نہ کوئی قیمت ہوتی ہے، لیکن انسان کی کوئی قیمت نہیں رہتی۔

وہ دولت کمانے کی دھن میں انسان کو اشیا کے برابر بھی رتبہ دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ اسی لیے دولت سے بے نیاز ہونے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کام اور محنت کو حصولِ دولت کی شرط نہ قرار دیا جائے۔ یعنی ایک باعزّت زندگی گزارنے کے لیے تو کام اور محنت ضروری ہوں، لیکن حصول دولت کے لیے ضروری نہ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کام کرے یا نہ کرے اُسے دولت ضرور ملتی رہے۔ میں سمجھتا ہوں دولت کی فکر نہ ہو تو آدمی نکمّا رہ بھی نہیں سکتا۔ معاشرہ میں ہر قسم کا نکمّا پن اسی فکر سے پیدا ہوتا ہے۔ دولت مند اور مفلس دونوں ہی اس فکر میں مبتلا رہتے ہیں۔ دولت مندوں کو یہ فکر فضول خرچ اور اوباش یا کنجوس بنا دیتی ہے اور غریبوں کو نکھٹو اور غلام۔ اسی خیال کو دوسرے طریقے سے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ دولت کی فکر ہی ہے جس کی بدولت انسان امیر یا غریب ہوتا ہے۔

میرے خیال میں دولت کو ایک سدا بہار خود رُو ثمر دار درخت کی مثال ہونا چاہیے۔ جس سے ہر شخص جب بھی چاہے بلا تکلّف مستفید ہو سکتا ہو۔ کیونکہ دولت کمانے کی چیز نہیں ہے یہ تو زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے اور لٹانے کی چیز ہے۔ انسان کے کمانے کی چیزیں تو زندگی کی کچھ نیک نامیاں اور رسوائیاں ہوتی ہیں۔ اگر ہم صرف دولت پر بھروسہ کریں تو نہ مشہور ہو سکتے ہیں اور نہ معتوب۔ سچّی شہرت اور سچّے دُکھ (یعنی شعور) کے لیے محنت درکار ہے۔ محنت انسانی زندگی کی کامیابی کا سب سے بڑا اصول ہے لیکن دولت کی فکر میں آدمی اسی عظیم اصول کو فراموش کر جاتا ہے اور یوں اُس کی ذات عموماً زندگی کی عظمتوں سے محروم ہو کر رہ جاتی ہے۔

مبالغہ

مبالغہ ایک مستقبل ہے اور حقیقت ایک حال۔ جو تعلق حال کا مستقبل سے ہوتا ہے وہی تعلق حقیقت کا مبالغہ سے ہے۔ جس طرح مستقبل کو حال سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح مبالغہ کو حقیقت سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہ رشتہ کسی نہ کسی طرح جوڑنا پڑتا ہے۔ ہم حساب کتاب کے آدمی بننے کی ہزار کوششیں کریں لیکن مفروضے قائم کیے بغیر بات نہیں بنتی۔ جہاں فرض کرو کی بات چلی سمجھ لیجیے حقائق کی سنگین دنیا سے نکل کر ہم خوابوں کی پُر اُمید وادیوں میں داخل ہوئے۔ خواب اور حقیقت — حقیقت اور خواب — بات ایک ہی ہے، فرق صرف وقفوں کا ہے۔ وقفے نہ ہوتے تو یہ سارا جھگڑا ہی ختم تھا۔ بہر طور حال کے مسائل مستقبل کو جنم دیتے ہیں اور حقیقت مبالغہ کا باعث بنتی ہے۔

مبالغہ ہمارے خوابوں کا سہارا ہے۔ فنونِ لطیفہ تو اس کے بغیر ایک قدم آگے نہیں چل سکتے — وہ فن کیا جس میں تاثیر نہیں۔ لیکن فن میں تاثیر پیدا کرنے والی شے مبالغہ ہے۔ فن چاہے کوئی ہو، اُس میں چمک دمک لازمی ہے۔ اگر کوئی فن ہمارے حسیات میں بجلیاں سی نہیں کوندا سکتا، تو ہم اُسے فن نہیں کہیں گے۔ یہ بجلیاں کیا ہیں؟ سب کا سب مبالغہ اور اُس کے

کرشمہ۔ اچھا راگ مبالغہ، اچھی تصویر مبالغہ، اچھا افسانہ مبالغہ، اچھی نظم یا غزل مبالغہ ——
حُسن بھی تو مبالغہ کا ایک نام ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب وہ بے نقاب ہوتا ہے، تو اُسے ہم حُسن کہہ دیتے ہیں، جب تک پردوں میں رہتا ہے ہمارے دیدہ و دل اُس کے تصوّر سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ انسانی ذہن میں پوشیدہ چیزوں کو دیکھنے کی قدرت موجود ہے، لیکن ظاہر کی آنکھ اُسے ہمیشہ مجبور کرتی ہے کہ حُسنِ پردہ نشیں کی ایک جھلک اُسے بھی دکھا دے ورنہ وہ زبان کو اُس حُسن کے اِنکار پر آمادہ رکھے گی۔ بس اِسی ضد کے نتیجے میں ہم چھُپی ہوئی حقیقت کے ذکر کو مبالغہ کہہ دیا کرتے ہیں۔

مبالغہ میں ہماری تمنّا اور آرزو ایک نیا روپ دھار کر سامنے آتی ہے۔ ایک بات کو ہم بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ تمنّا کو تمنّا نہیں رہنے دیتے بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں جیسے اُس کی تکمیل ہو گئی۔ خواب حقیقت میں بدل گیا۔ دشمن کو ذلیل بنانے پر آئے تو اُسے ساری کائنات سے بڑھ کر کمینہ کہہ ڈالا۔ دوست کی عزّت کا ذکر کیا تو اُسے عرشِ معلّی پر لا بٹھایا۔ حقیقت میں نہ دشمن اتنا ذلیل ہے اور نہ دوست اتنا معزّز۔ مگر ہمیں تو اپنی تمنّا کا اظہار مقصود ہے، حقیقت کو کہاں کہاں سر پر اُٹھائے پھریں۔ اِس کے علاوہ حقیقت پر بھروسہ بھی کون کرے۔ گھڑی میں ماشہ گھڑی میں تولہ۔ لمحہ لمحہ گھٹتی، بڑھتی، پھیلتی اور سُکڑتی رہتی ہے۔ حقیقت کی اِسی لچک سے آدمی خوب فائدہ اُٹھاتا ہے۔ لیکن یہی لچک اُس کے ہوش بھی ٹھکانے لگا دیتی ہے۔

ادراک کے مختلف ذرائع ہیں —— عقل ہمیں بات سمجھاتی ہے لیکن بڑے خشک انداز میں —— پھونک پھونک کر قدم رکھنا اِس کا خاصہ ہے۔ جذبات کے ذریعہ بھی ہم تک معنی کی رسائی ہوتی ہے، لیکن یہاں طریقہ نہایت مختلف ہوتا ہے۔ ایک طرف خشکی ہے تو دوسری طرف سیلاب کی حد تک تری۔ مبالغہ کی بنیاد جذبات پر ہے۔ محبّت اور نفرت کے بغیر مبالغہ وجود میں نہیں آسکتا۔

یہ دونوں جذبے ادراک کا بہت بڑا وسیلہ ہیں۔ اسی لیے مبالغہ کی صورت میں ہمیں جس انداز سے حقیقت کا چہرہ بے نقاب ہوتا نظر آتا ہے اُس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی یہی بے مثالی مبالغہ کو یقین کی حدود سے باہر نکال دیتی ہے۔ ہمارے یقین کا معاملہ بھی کچھ عجیب سا ہے۔ ہم اُن باتوں پر زیادہ یقین رکھتے ہیں جن میں صداقت کم ہوتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی۔ جہاں حقیقت سامنے آئی اور ہم تذبذب کا شکار ہوئے۔ سچّی باتوں پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا اور جھوٹی باتوں پر خود بخود یقین آجاتا ہے۔ مبالغہ کو ہم اسی لیے شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کیونکہ اس کی بنیاد حقیقت پر ہوتی ہے۔ جذبات کی بدولت مبالغہ بے پناہ خلوص کا مظہر بن جاتا ہے۔ اخلاص مبالغہ کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ چونکہ محبّت اور نفرت ایسے جذبات اُسے جنم دیتے ہیں، اس لیے مبالغہ میں خون گردش کرتا نظر آتا ہے۔ تکلّف سے کیے ہوئے مبالغہ میں نہ کوئی تاثیر ہوتی ہے، نہ چمک اور مہک۔ میں تکلّف کو بُرا نہیں سمجھتا لیکن مبالغہ کے حق میں اس سے زیادہ مہلک کوئی اور شے نہیں ہے، بلکہ اگر سچ پوچھا جائے تو مبالغہ کو بدنام کرنے والی چیز ہی تکلف ہے۔ تکلّف نہ ہو تو مبالغہ زندگی کے بہت سے راز کھول کر رکھ دے۔ پُر تکلّف مبالغہ کی بہترین مثالیں ہمارے اردو فارسی شعرا کے اُن قصائد میں بآسانی دستیاب ہوسکتی ہیں جو انھوں نے اپنے صاحب ثروت ممدوحین کی شان میں ارشاد فرمائے ہیں۔ دراصل تصنّع سے مبالغہ کی صورت ہی نہیں بگڑ جاتی بلکہ اُس کی اصل رُوح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ گویا ہم کوشش بھی کریں تو تکلّف کے ساتھ مبالغہ نہیں کر سکتے۔ بناوٹ سے کہی ہوئی اُونچی اُونچی باتوں میں مبالغہ نہیں ہوتا کچھ اور ہوتا ہے۔ اِسے ہم لاف زنی کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ مبالغہ سے زیادہ حقیقت سے قریب کون چیز ہو سکتی ہے۔

محبّت میں آکر جب انسان مبالغہ کرتا ہے تو ایک طرف وہ کائنات کی تمام رعنائیاں اور خوبصورتیاں اپنی محبوب ہستی میں دیکھنا چاہتا ہے اور دوسری طرف اُسے دنیا بھر کے ذوق و

شوق کو اپنی ذات میں سمیٹ لینے کی آرزو ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبت میں انسان حسن و عشق دونوں کو پوری طرح جذب کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس نفرت کی صورت میں انسان مبالغہ کے ذریعے ناپسندیدہ شے سے اپنی مکمل علحدگی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ سوچتا ہے، جب برائی کی صورت دیکھنا ہی پڑ گئی ہے تو پوری طرح کیوں نہ دیکھی جائے۔ حسن ہو یا قبح اگر ان کا مشاہدہ جی بھر کر نہ کیا جائے تو پھر نہ حسن سے آگاہی حاصل ہوتی ہے اور نہ قبح سے ـــــ ایسی صورت میں انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ چنانچہ یہ عجیب بات ہے کہ وہ مبالغہ کی بدولت شک و شبہ کے جھٹپٹے سے نکل کر یقین کی روشن صبح میں قدم رکھنا چاہتا ہے۔

مبالغہ کے وقت انسان کو زندگی سے نزدیک تر ہونے کا شدید احساس ہوتا ہے۔ وہ اُس لمحہ یوں محسوس کرتا ہے جیسے زندگی نے اُسے اس گرمجوشی کے ساتھ اپنی آغوش میں لے لیا ہے کہ اب موت کا طاقتور ہاتھ بھی اُس کو جدا نہیں کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ مبالغہ کے ذریعے ہم پر اس اہم حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ زندگی کے رگ و پے میں انسانی ذہن کی جڑیں کس مضبوطی کے ساتھ پھیلتی اور پیوست ہوتی چلی گئی ہیں۔

عام انسان اگر مبالغہ سے کام نہ لے تو اُس کی حالت ایک مشین کی سی ہو کر رہ جائے یعنی دن رات ایک ہی ڈگر پر چلتے رہنا ـــــ موجودہ راستوں پر قدم بھی اُٹھیں لیکن امکانی راستوں کی نشاندہی بھی ہوتی رہے۔ "ہے" کے ساتھ اگر "ہو سکتا ہے" اور "ہوگا" کی بات نہ کریں تو ہم میں اور دوسری مخلوقات میں کونسی چیز وجہِ امتیاز رہ جاتی ہے۔ جذباتی لگاؤ کے ساتھ "ہو سکتا ہے" اور "ہوگا" کی امید افزا باتوں کو "ہے" میں بدل کر بیان کرنے کا نام ہی تو مبالغہ ہے۔ بہر حال میں سمجھتا ہوں جو شخص روزمرہ زندگی میں مبالغہ سے کام لیتا ہے وہ اگر کچھ اور نہیں تو زندگی کے ساتھ اپنی گہری وابستگی کا اظہار ضرور کرتا ہے۔ لیکن زندوں کو زندگی سے گہری وابستگی کب نہیں ہوتی

مبالغہ تو دِل والوں کے جسم وجاں میں رُوح بن کر جاری وساری ہے۔

اور سب باتیں چھوڑیے۔ مبالغہ سے انسانی فطرت کی ایک ایسی حیات افروز ادا کا پتہ چلتا ہے جس کی بدولت زندگی میں ہمیشہ چراغاں ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا ہم اس ادا کو تکمیل کی خواہش کہہ سکتے ہیں۔ انسان روزِ ازل سے PERFECTION کمال کے لیے سرگرداں ہے۔ وہ جس وقت بھی کوئی قدم اُٹھاتا ہے اُسی وقت اُس کے دل میں منزلِ کمال تک پہنچنے کی تمنا کا چراغ روشن ہو جاتا ہے ــــ مبالغہ میں اُس کی یہ آرزو شعلۂ جوالہ بن کر لپکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مبالغہ کرتے وقت انسان حقیقت کو اُس کی انتہا تک لے جانا چاہتا ہے اب یہ الگ بات ہے کہ کوئی زبان وبیان کے ذریعے حقیقت کے پایۂ عروج کو چھُونا چاہے اور کوئی عملاً اُس کو جالے۔ بات قول کی ہو یا عمل کی، تکمیل کی آرزو دونوں جگہ موجود ہے۔ عمل کا گھر تو ہمیشہ دُور رہا ہے اور یہ نزدیک ہو کر بھی دُور ہو جاتا ہے۔ لیکن قول یعنی مبالغہ کی تابندہ مشعل نے راستہ دکھانے اور دل بڑھانے سے کبھی گریز نہیں کیا۔

رہا آباد عالم

اندھوں میں کانے کی حیثیت کو میں نے دل سے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ میری ناکامیوں کی یہ سب سے بڑی وجہ ہے۔ میں جب بھی اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے بیٹھا ہوں، کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ سنا ہے کانا ہونا تو بڑی بات ہے، کانے کی حیثیت کو تسلیم کر لینے ہی سے آدمی پر کامیابیوں کے بے شمار دروازے کھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ادھر اپنا یہ حال ہے کہ کانے لوگ ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ ان کی طرف سے گزر کر ہوا بھی آتی ہے تو خون کھولنے لگتا ہے۔ آپ اس کیفیت کو میرے احساسِ کمتری کی ایک صورت بھی کہہ سکتے ہیں اور مجھ پر حقائقِ حیات سے گریز کا الزام بھی عائد کیا جا سکتا ہے۔ ویسے سچ پوچھیے تو میں اندھا ہوں اور کانوں سے خواہ مخواہ جلتا ہوں۔

کہتے ہیں اندھا ہونا کوئی خطرناک بات نہیں۔ اندھا آدمی جب چاہے ذرا سی کوشش سے کانا بن سکتا ہے۔ اندھے اور کانے میں ایسا فرق ہی کونسا ہے، یہی ناکہ اندھے کو تصویر کا کوئی رخ نظر نہیں آتا اور کانے کو صرف ایک رُخ نظر آتا ہے۔ تصویر کے پُورے حسن و قبح سے دونوں محروم ہوتے ہیں۔ شاید میں اسی بنا پر کانے کی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اندھے سے کانے ہونے تک کا سفر خواہ کتنا ہی آسان کیوں نہ ہو، ہر اندھے کو کانا بن جانے

کی توفیق حاصل نہیں ہوتی۔ اندھے لوگ کانوں کو اپنے سردار مان لیں گے، مگر خود کانا بننے کی سعی سے عموماً گریز ہی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ تساہل کے سوا اور کچھ نہیں۔ تساہل ایک ایسی بادشاہت ہے جس کا تاج ہر کوئی اپنے سر پر سجا سکتا ہے۔

کوئی مانے یا نہ مانے، دنیا کانوں کی ہے۔ کانے حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ وہ خواب نہیں دیکھتے، خواب چراتے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں خواب دیکھنے سے خواب چرانا ہزار درجے بہتر کام ہے۔ خواب دیکھنے والا زندگی سے فرار کا مرتکب ہوتا ہے۔ خواب چرانے والا حقیقت پسند کہلاتا ہے۔ جس طرح چور اپنی چوری کی چیزوں کو جلد سے جلد ٹھکانے لگانے کی سوچتا ہے۔ اسی طرح خوابوں کے چور اپنے ان مسروقہ خوابوں کو جوں توں کر کے حقیقت میں بدل ڈالنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس فکر اور عجلت کا فائدہ یہ ہے کہ چوری بھی نہیں پکڑی جاتی اور اعتبار بھی قائم رہتا۔ ادھر خواب دیکھنے والوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے خوابوں کی پینگ ہی میں اونگھ رہے ہوتے ہیں۔ انھیں کچھ ہوش آتا ہے تو اپنے ان خوابوں کو ادھورے پن کے ساتھ حقیقتوں میں بدلا ہوا دیکھ کر سر پیٹ لیتے ہیں "وائے بدنصیبی! ہماری ساری محنت اکارت گئی...... اچھا...... تو کوئی دوسرا خواب" یہ کہہ کر وہ پھر سحر فکر میں ڈوب جاتے ہیں اور یوں دنیا ادھورے خوابوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ کون جانے کہ کبھی خواب دیکھنے والوں کو بھی یہ سعادت نصیب ہوگی کہ وہ اپنے خوابوں کو خود حقیقت میں تبدیل کر سکیں۔ ویسے ہمیں کانوں کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ جس طرح بھی بن پڑتا ہے، وہ بے چارے ان خوابوں کو چرا کر حقیقتوں میں بدلنے کی سعی تو کرتے ہیں۔ میری ہٹ دھرمی تو دیکھئے میں پھر بھی اُن کا شکر گزار نہیں ہوتا۔ حالانکہ ابھی تک دنیا میں انسانی سعی کی بدولت جو کچھ حسن و جمال پیدا ہوا ہے، اس کا زیادہ حصہ کانوں کا مرہونِ منت ہے۔

قصّہ دراصل یہ ہے کہ زندگی کی نام نہاد حقیقتوں کو سمجھنے کے لیے کانا ہونا بے حد ضروری ہے۔ آدمی کانا ہو کر دُنیا پر نظر ڈالتا ہے تو اُسے ہر چیز ٹھکانے پر دکھائی دیتی ہے، ایک آنکھ بند کر کے ہی تو کسی چیز کا نشانہ باندھا جاتا ہے۔ نشانہ بندھ جائے، تو پھر اُس چیز کو اپنے قابو میں سمجھئے۔ اس لیے میں یہ کہا کرتا ہوں کہ اشیاء عالم کی نظم و ترتیب میں کانوں کا کوئی حصّہ ہو یا نہ ہو، کانے چیزوں کو استعمال کرنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ یوں لگتا ہے جیسے استعمال یا برتنے کا لفظ ہی کانوں کی ایجاد ہے۔

یہ بالکل الگ مسئلہ ہے کہ اشیاء کو استعمال میں لا کر اُن کی (یعنی اشیاء کی) روح کو کہاں تک برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ عام طور پر تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ جس چیز کو ہم نشانہ بناتے ہیں اُسے زندہ نہیں چھوڑتے۔ شے زندہ رہے یا نہ رہے کانے بہرحال زندہ رہتے ہیں۔ یہی اُن کی جیت ہے اور یہی اُن کی کامیابی۔

برتنے اور استعمال کرنے ہی کی بات نہیں، ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو زندگی کو سمجھنے میں بھی کانے سب سے آگے ہیں۔ اندھے زندگی سے ڈرتے ہیں۔ آنکھوں والے اسے قابو میں رکھنا چاہتے ہیں۔ کانوں کا رویّہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ وہ موقع و محل کے مطابق ڈرتے بھی ہیں اور نہیں بھی ڈرتے۔ کانوں کی گیدڑ بھبکیاں تو مشہور ہیں، جنھیں پنجابی زبان میں دفعہ یرکانوے کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کبھی وہ زندگی کو قابو میں لانے کی سوچتے ہیں اور کبھی خود اُس کے قابو میں آجاتے ہیں۔ اگر کچھ اور نہیں بنتا تو زندگی کو ایک بھاگتا ہوا چور سمجھ کر اُس کی لنگوٹی تو کسی طرح ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ادھر اندھوں میں تو خیر کوئی حوصلہ ہی نہیں ہوتا، رہے آنکھوں والے تو یہ کبھی گوارا ہی نہیں کر سکتے کہ زندگی خواہ چور بن کر سہی اُن کے سامنے سے بھاگے اور وہ اس کی لنگوٹی کھینچ کر اسے برہنہ کر ڈالیں۔ کتنے ہیں آج تک آنکھوں والوں

کی یہی شرم ان کی ناکامیوں کا سبب بنی ہوئی ہے۔ اگر وہ ذرا بے شرم ہو جائیں، تو زندگی میں ان سے بڑھ کر کوئی کامیاب نہ ہو۔ لیکن آنکھوں والوں کا کہنا ہے کہ وہ کیسے شرم و حیا کو اپنے سے جُدا کر سکتے ہیں۔ اسی شرم و حیا کی بدولت تو ان کی آنکھوں میں روشنی کا ایک جہان آباد ہے۔

ہمارے ایک دوست مدرّس ہوا کرتے تھے۔ جب تک وہ مدرّس رہے ہم نے اُنھیں کبھی ہنستے نہیں دیکھا ہر وقت روتے ہی رہتے۔ کچھ عرصے بعد مقابلے کا امتحان پاس کر کے ایک اعلیٰ افسر بن گئے۔ اب جو اُنھیں دیکھا تو بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ پوچھا کیا حال ہے؟ "کہنے لگے "اللہ کا شکر ہے بڑے مزے میں گزر رہی ہے"۔ میں نے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ذرا بلند آواز سے "اچھا؟" کہا تو وہ قدرے تامّل کے بعد نگاہیں جُھکا کر ایک ہلکی سی آہ کھینچتے ہوئے بولے" اتنا ضرور ہے کہ پہلے کانا نہیں تھا، اب کانا ہو گیا ہوں"۔۔۔ مجھے اس پر اپنی بستی کا ایک اندھا فقیر بے ساختہ یاد آ گیا جو لوگوں سے بھیک مانگنے کی ناکام کوشش میں اس طرح کی عجیب و غریب صدائیں لگایا کرتا تھا۔ "اے آنکھوں والو! دنیا میٹھی ہے، تو کانے بن جاؤ ــــــ اندھے بنو گے تو میری طرح بھیک مانگو گے، آنکھیں کھولو گے تو دنیا کچھ سے کچھ نظر آئے گی۔ میری مانو! دُنیا کے مزے لُوٹنے ہیں تو کانے بن جاؤ ـــــ"

یہ بات تو سو فیصد صحیح ہے کہ پُوری طرح آنکھیں کھول کر دیکھنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ پُوری طرح آنکھیں کھول کر دنیا کو دیکھا جائے تو پاؤں تلے کی زمین سرکنے لگتی ہے۔ میں نے یہ بات سن سُنا کر نہیں بلکہ اپنے تجربے کی بنا پر کہی ہے۔ ممکن ہے یہاں مجھ پر تعلّی کا الزام عائد ہو جائے اور کوئی کہے خوب، مشکور بھی آنکھیں کھول کر، دُنیا کو دیکھنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کے جواب میں یہ عرض ہے کہ بعض وقت آنکھیں اچانک بھی کھل جاتی ہیں اور پھر یہ

بھی کیا ضروری ہے کہ آنکھیں کُھلیں تو حقیقت بھی سامنے بے نقاب بیٹھی نظر آجائے۔ ۔

بہر حال تجربہ بیان کرتا ہوں، خواہ وہ آپ کو بے تکا ہی کیوں نہ معلوم ہو ــــ میں ایک دن اچھا خاصا بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا کہ یکایک میری آنکھیں کُھل گئیں۔ آنکھوں کا کھلنا تھا کہ مجھے اپنے ارد گرد کی ہر شے اجنبی معلوم ہونے لگی۔ سامنے ایک بزرگ چچا جان بیٹھے تھے، اُن پر نظر پڑی تو وہ بھی کسی اور دُنیا کی مخلوق نظر آئے۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا "آپ کون ہیں؟ اور کہاں سے آئے ہیں؟" چچا جان نے ڈانٹ کر کہا "برخوردار! بڑوں سے مذاق کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی" ــــ مجھے یوں لگا جیسے چچا جان کوئی بھوت یا چھلاوا ہیں۔ اس کے بعد کئی دن تک مجھے ہر آدمی ایک بھوت نظر آتا رہا اور خوف سے میری جان پر بنی رہی۔ وہ تو دعائیں دیجیے عورت ذات کو کہ مجھے جب کچھ خوبصورت شکلیں نظر آئیں تب کہیں جا کر یہ احساس اور اطمینان ہوا کہ دنیا بھوتوں ہی کا گھر نہیں یہاں پریاں بھی آباد ہیں۔ آنکھیں کُھلنے کے ضمن میں ایک تجربہ اور سن لیجیے۔ گرمی کا زمانہ تھا میں گھر میں شام کو بجلی کے پنکھے کے سامنے بیٹھا گرم ہوا کے مزے لوٹ رہا تھا کہ کسی نے غالب کا یہ مشہور شعر پڑھا ہے۔

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

بس جناب جو لفظ شعر کی جان تھا اُس نے چشم زدن میں ہماری آنکھیں کھول کر رکھ دیں . . . . . موت! . . . . . ایسا محسوس ہوا جیسے میری جان نکل رہی ہے۔ اعضا سُن ہوئے جا رہے ہیں۔ میں پریشان ہو کر اُٹھنے لگا تو بیوی نے میری طرف دیکھ کر پوچھا

"خیریت تو ہے، آپ کا چہرہ یک لخت زرد کیوں پڑ گیا"۔ ہاتھ پاؤں چھو کر دیکھے تو گھبرا کر بولی" ارے آپ تو ٹھنڈے ہوئے جا رہے ہیں"۔ میں نے کہا" بیگم! مجھے سہارا دے کر ذرا اٹھاؤ۔ میں ٹھنڈا نہیں ہوا، میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ زمین پہ قدم رکھوں گا تو پھر بند ہو جائیں گی اور مجھ میں طاقت بھی آ جائے گی"۔ بیوی بولی" معلوم نہیں بعض وقت کیا اُلٹی سیدھی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اپنے پلّے تو ایک لفظ نہیں پڑتا"۔

یہ دو واقعات سنانے سے میرا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ مجھ میں آنکھیں کھول کر بات کرنے کی تو بالکل ہمت نہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں اندھوں کی طرح بھی زندگی نہیں گزارنا چاہتا۔ لہٰذا میرے ساتھ یہ ہو رہا ہے کہ آنکھیں بند کرتا ہوں تو دیکھنے کی آرزو دبوچ کر ڈالتی ہے، آنکھیں کھولتا ہوں تو اپنے آپ میں دید کی تاب نہیں پاتا۔ رہا یہ سوال کہ میں کانا کیوں نہیں بن جاتا۔ اس بارے میں یہ عرض ہے کہ کانا بننے سے کسی فرو بشر کو مفر نہیں جینے کے لیے کانا تو ہونا پڑتا ہے۔ آپ دائیں آنکھ بند کر کے بائیں کھولیں، یا بائیں بند کر کے دائیں، اس سے صورتِ حال ذرّہ برابر نہیں بدلتی۔ ایک آنکھ سے جب بھی کوئی دیکھتا ہے اُسے صرف اپنی ذات نظر آتی ہے۔ اِس اعتبار سے کسی حد تک کانا ہونے کا جواز ہر انسان کے پاس موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ ہر شخص کی ایک آنکھ تو کبھی نہ کبھی ارادے کے بغیر بھی بند ہو ہی جاتی ہے۔ اصلی کانے تو وہ ہیں جو کسی وقت بھی اپنی دوسری آنکھ نہیں کھُلنے دیتے۔ آخر میں کانا بننے سے متعلق میرا ایک تجربہ اور سُن لیجیے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، عام طور سے میں اندھا رہتا ہوں، لیکن میں نے جب بھی جان بوجھ کر اپنی ایک آنکھ کھولی، ایک بند کی ہے اور کانا بننا چاہا ہے تو مجھے یوں لگا ہے جیسے "حسینۂ کائنات" سخت خفگی کے عالم میں چلّا کر کہہ رہی ہے "بدمعاش کہیں کے! آنکھ مارتا ہے۔ مجھ سے رابطہ ہی پیدا کرنا

ہے تو ڈرتا کیوں ہے ؟ سچے چاہنے والوں کی طرح دلیرانہ انداز میں آنکھیں چار کیوں نہیں کرتا"۔۔۔ یہ سُن کر میں وہ ایک آنکھ بھی بند کر لیتا ہوں اور اپنے اندھے پن کو تو کچھ نہیں کہتا بے چارے کانوں کو گالیاں دیتے ہوئے غالب کا یہ شعر پڑھ کر خاموش ہو جاتا ہوں ؎

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
پڑے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے
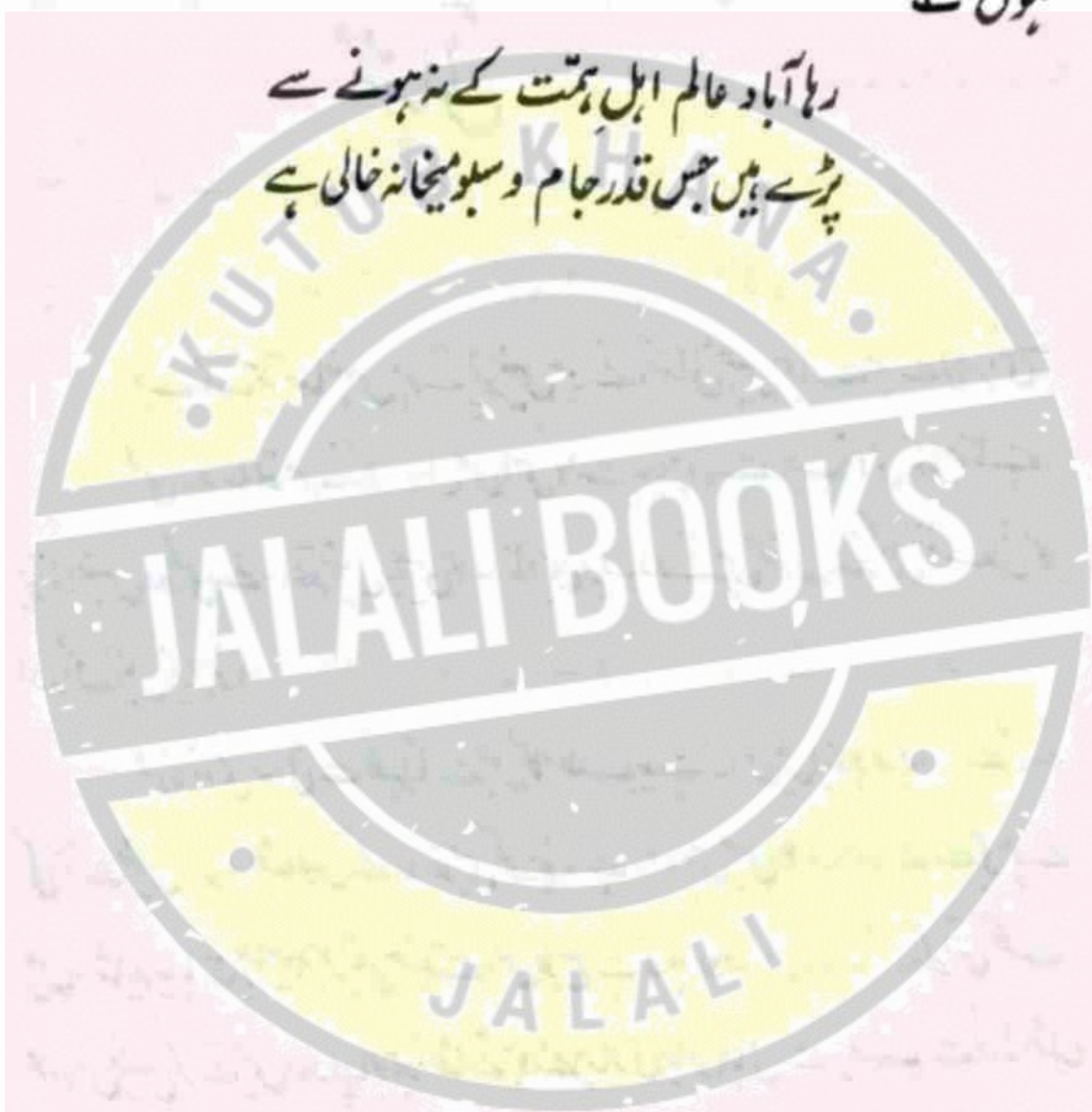
تنہائی

جب تک ہم تنہا نہیں ہوتے کچھ نہیں ہوتے۔ تنہائی ہمیں ہمارے ہونے کی خبر دیتی ہے، کسی کے ساتھ ہونے کا سوال بھی اسی وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب آدمی تنہا ہوتا ہے۔ جو تنہا نہیں وہ کسی کے ساتھ نہیں۔ بیکسی کا رونا وہی لوگ روتے ہیں جنھوں نے کبھی تنہائی کا ادراک نہیں کیا ہوتا۔

عموماً آدمی تنہائی سے گھبراتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اپنا بوجھ برداشت کرنے کی ہمت نہیں۔ عام انسانوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔ وہ اپنی ہستی کا بار اُٹھانے سے جی چراتے ہیں۔ شاید یہ بات برعکس معلوم ہو لیکن حقیقت اس طرح ہے کہ ہم دوسروں کا بوجھ اُٹھا کر اتنی تکلیف محسوس نہیں کرتے جس قدر اپنا بوجھ اُٹھاتے ہوئے ہماری جان جاتی ہے۔ بہت سے لوگ دوسروں کا بوجھ اُٹھاتے ہی اس لیے ہیں تاکہ انھیں اپنا بوجھ نہ اُٹھانا پڑے۔

تنہائی میں توانائی ہے۔ انسان تنہا ہو تو دنیا اس کے ساتھ چلتی ہے۔ تنہا نہ ہو تو اسے دنیا کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔

تنہا ہونا اپنے ساتھ ہونا ہے۔ ہم اپنے ساتھ ہونے سے زیادہ دوسروں کے ساتھ ہونے

کو اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ دوسروں کے ساتھ ہو کر ہم اپنے آپ سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے ساتھ ہونے سے ہمیں خواہ مخواہ اپنے آپ کو دیکھنے کا موقع بہم پہنچتا ہے۔ ادھر اپنے آپ کو دیکھنا دنیا کو دیکھنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ہم اسی مشکل کام سے جان بچاتے رہتے ہیں۔ یہ احساس لاکھوں میں سے کسی ایک کو ہوتا ہے کہ تنہائی کے کڑوے گھونٹ میں امر کر دینے کی طاقت موجود ہے۔

ہر شخص یکتا ہے کیونکہ ہر شخص تنہا ہے۔ ہماری یکتائی اسی لیے خاک میں مل جاتی ہے کہ ہم اپنی تنہائی سے غافل ہو جاتے ہیں۔ آدمی جس قدر تنہا ہو اس میں اسی قدر یکتائی پیدا ہو جاتی ہے۔

دنیا سے نفرت کرنے والے ہمیشہ دنیا میں اُلجھے رہتے ہیں۔ دنیا سے وہی نجات حاصل کرتا ہے جو دنیا سے محبت کرتا ہے۔ تنہائی میں ہم پر اپنے پیار کے راز ہی منکشف نہیں ہوتے، دوسروں سے پیار کرنے کے سلیقے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ دنیا سے روٹھ کر آدمی تنہا نہیں بیٹھتا۔ تنہا بیٹھے تو دنیا اُسے منانے آجاتی ہے۔

تنہائی ایک آئینہ ہے۔ اگر ہم دیکھنا چاہیں تو اس میں بے شمار عالم دیکھ سکتے ہیں۔ ہستی کا کون سا روپ ہے جسے انسان تنہائی میں نہیں دیکھ سکتا؟

تنہائی ان لوگوں کو محرومیوں اور ناکامیوں کا احساس دلاتی ہے جو اس سے گریز کرتے ہیں۔ تنہائی سے پیار کے صلے میں خود اعتمادی حاصل ہوا کرتی ہے۔

بے یاری و مددگاری سے بھی تنہائی کا رشتہ اسی وقت قائم ہوتا ہے جب انسان کا رشتہ اپنی ذات سے ٹوٹ جاتا ہے۔ بے یار و مددگار وہ شخص نہیں ہے جس سے دُنیا والے غافل ہو گئے ہیں، بلکہ وہ شخص ہے جو اپنے آپ سے غافل ہو گیا ہے۔ اپنی یاری سب سے پکّی یاری

ہے دیہ الگ بحث ہے کہ لوگ اپنی یاری کا مطلب ہمیشہ غلط نکالتے ہیں اور خود غرض بن جاتے ہیں)

تنہائی تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ دُنیا میں ہماری بات سمجھنے والا کوئی نہیں۔ ہم اس دُنیا میں تنہا آئے تھے اور تنہا چلے جائیں گے، تو اس شکایت کا مطلب اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ زندگی کے جن حقائق سے ہم دوچار ہیں ان سے اور ان کے ذائقہ سے دوسرے ناآشنا ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ہر ذات اپنے دامن میں کچھ حقیقتیں ایسی رکھتی ہے جو صرف اسی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ انہی چند مخصوص حقیقتوں کے مجموعہ کا نام تنہائی ہے۔ اور جب یہ چند حقیقتیں اپنی جگہ حرکت میں آتی ہیں انسان کے ہاتھوں تخلیقی عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل کے آغاز کے ساتھ ساری دنیا آدمی کی تنہائی میں جذب ہونے کی آرزومند ہو جاتی ہے یا اس طرح کہہ لیجیے کہ آدمی کی تنہائی ساری دنیا میں نفوذ کرنے لگتی ہے۔

اگر ہم اپنے دل کی بات کسی پر ظاہر کر دیں اور وہ ہمارا ہمنوا بن جائے تو پھر ہمیں تنہائی کا احساس اتنا پریشان نہیں کرتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے دل کی بات ایک ایسا سلسلہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس لمحے اگر کسی نے ہمارے دل کی بات مان لی تو دوسرے لمحے کیا ہوگا؟ دوسرے لمحے کا احساس انسان کو ہمیشہ تنہا رکھتا ہے۔

تنہائی سے خوف کھانے والے کو ہر نئی چیز ڈراتی ہے۔ انسان تنہائی میں ڈرتا بھی اس لیے ہے کہ اسے اس وقت ایسی ایسی چیزیں نظر آتی ہیں، جنھیں اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوتا۔ جیسے جیسے ہمارا ذہن نئی باتیں سوچتا ہے۔ ویسے ویسے ہم نئے انداز میں تنہا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جب تک کوئی چیز بے معنی ہے ، تنہا نہیں ہے، معنی پیدا ہوتے ہی ہر شے تنہا ہو جاتی ہے۔ گویا معنی کی زنجیریں پہنا کر ہم اشیا کو تنہائی کی قید میں ڈال دیتے ہیں۔

ہستی کی ساری عمارت تنہائی کے اصول پہ قائم ہے۔ ہر کوئی ظاہر و باطن میں تنہا ہے۔ تنہا نہ ہو تو نہ وہ خود کو پا سکے اور نہ کوئی اُسے پا سکے۔ جہاں جہاں تک تنہائی آشکار ہوتی ہے وہاں وہاں تک لوگ ہمیں ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ دُنیا ہماری تنہائی کے درپے ہے۔

تنہائی اس وقت ایک غیر فانی حقیقت بن جاتی ہے جب زمانہ اسے تسلیم کر لیتا ہے لیکن زمانہ ہر تنہائی کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ نہ جانے کتنی ٹھوکریں کھا کر ایک تنہائی، تنہائی بنتی ہے۔

کوئی تنہائی دوسری تنہائیوں کا سہارا لیے بغیر اپنی تکمیل نہیں کر سکتی۔ ہم تنہائی کی خاطر لوگوں سے ملتے ہیں۔ اور لوگوں سے ملنے کے لیے تنہا ہوتے ہیں۔ تنہائی ہمیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

آدمی سطح پر چلتا رہے، تو کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ جہاں اس نے ذرا اُوپر اُٹھنے کی کوشش کی یا گہرائی میں جانے کا خیال کیا اور وہ تنہا ہوا۔

تنہائی ایک دُکھ ہے۔ ایک راحت ہے۔ جو لوگ دُکھ اور سُکھ کو علیحدہ کر کے دیکھنا چاہتے ہیں وہ انجانے طور پر اپنی زندگی کی سالمیت کو چکنا چور دیکھنے کے متمنّی ہیں۔ تنہائی دُکھ اور سُکھ کی دوئی کو مٹا دیتی ہے۔

عقل کا استعمال

مجھے یہ بات ابتدا ہی میں واضح کر دینا چاہیے کہ میں انسان کے بے عقل ہونے کا بالکل قائل نہیں ہوں۔ میرے نزدیک کوئی شخص بے عقل نہیں ہوتا۔ دراصل میں اس بات کو کسی طرح تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ ایک شخص انسان بھی کہلائے اور عقل سے بھی عاری ہو۔ میں سمجھتا ہوں قدرت نے ہر فرد بشر کو متاعِ عقل سے بہرہ ور کیا ہے۔ انسان میں عقل کا نہ ہونا تو خیر بڑی بات ہے۔ میں، تو اِس کا بھی قائل نہیں کہ عقل کی تقسیم میں کسی طرح کا کوئی فرق پایا جاتا ہے — میرے خیال میں قسامِ ازل نے سب کو ایک ہی اندازے کی عقل مرحمت فرمائی ہے۔ اب آپ اِس اندازے کو خواہ ایک من کہہ لیں یا ایک سیر، بات ایک ہی ہے — مثال کے طور پر اگر زید کے حصے میں ایک سیر عقل آئی ہے تو یقین کیجیے بکر کو بھی ایک سیر عقل ہی مہیا کی گئی ہو گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مجھے ایک چھٹانک عقل ملی ہو اور آپ کو ایک ٹن — غالباً آپ کو یہ سُن کر افسوس تو ضرور ہو گا، لیکن حقیقت کچھ اِسی طرح ہے کہ عقل کے اعتبار سے آپ میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ جتنی عقل آپ کو ملی ہے اُتنی ہی مجھے ودیعت ہوئی ہے۔ اور کیا عجب ہے جو حماقتوں کے بوجھ نے میری عقل کو آپ کی عقل سے کچھ زیادہ ہی وزنی بنا دیا ہو۔ بہرحال عقل کی کمی یا بیشی کوئی معنی نہیں رکھتی —

اصل چیز اُس کا استعمال ہے۔

سچ پوچھیے تو عقل کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز وجود نہیں رکھتی اُس کا کوئی ٹھکانہ بھی نہیں ہوتا۔ عام طور پر جو کہا جاتا ہے کہ عقل انسان کے بھیجے میں ہوتی ہے، یہ بہت پرانا اور دقیانوسی نظریہ ہے۔ خدانخواستہ عقل انسان کے بھیجے میں ہوتی، تو اب تک دُنیا میں قیامت آگئی ہوتی۔ عقل کے بغیر ہی انسان نے زمین و آسمان ایک کیے ہوئے ہیں۔ اگر عقل بھی اُس کی ذات کا حصّہ ہوتی پھر، تو نامعلوم کیا سے کیا ہو جاتا —

بہر حال یہ بات طے شدہ ہے کہ انسان میں عقل اِس طرح ہرگز موجود نہیں جس طرح اُس کی کھوپڑی میں بھیجا رکھا ہوا ہے — آپ اگر انسانی جسم میں عقل کا کوئی مقام متعین ہی کرنا چاہتے ہیں، تو وہ ایک عامیانہ سے محاورے کے مطابق ٹخنہ ہے یعنی عقل انسان کے ٹخنوں میں ہوتی ہے۔ میں ٹخنے کو حرکت کی علامت سمجھتا ہوں۔ انسان اِس کے زور پر کھڑا ہوتا اور قدم آگے بڑھاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عمل اور تجربے کا دوسرا نام عقل ہے۔ جیسے جیسے انسان عمل کرتا ہے اُس کی عقل معرضِ وجود میں آتی چلی جاتی ہے۔

آپ اِسے حُسنِ اتفاق کہیں یا سُوءِ اتفاق، انسان خواہ کسی قسم کی حرکت کرے وہ اس کی عقل پر دلالت کرتی ہے۔ انسان کے کسی عمل کو اُس کی عقل سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ جو انسانی حرکات ذرا اُونچی قسم کی ہوتی ہیں اور ہماری سمجھ میں نہیں آتیں ہم اُنھیں عُجلت میں آکر دیوانہ پن کہہ ڈالتے ہیں؛ ورنہ بغور دیکھا جائے، تو ان میں بھی خالص عقل کے سوا کسی اور چیز کا نظر آنا ممکن ہی نہیں۔ اور تو اور انسان کے کھانسنے سے بھی عقل کا مظاہرہ ہوتا ہے، وہ چھینکتا بھی ہے، تو اُس کی عقل آنکھ اور ناک کے راستے سے فضا میں منتشر ہو جاتی ہے۔ ہنسنے، رونے اور سونے جاگنے کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے یہ، تو انسان

کے عقلمند ہونے کی واضح اور روشن دلیلیں ہیں۔ ایک صاحب کہنے لگے "سونا انسان کی دلیلِ عقلمندی کیسے ہوا؟ سوتا تو گھوڑا بھی ہے"۔ ہم نے فوراً جواب دیا "گھوڑا سوتا ضرور ہے لیکن کھڑے کھڑے، لہذا کھڑے ہو کر سونا بھی کوئی سونا ہے۔ یاد رکھیے آدم زاد کے سوا اور کوئی ذی حیات اِس چھنتی چلاتی کائنات میں لمبی تان کر نہیں سوتا۔ یہ شرف اِسی دوپائے کو حاصل ہے۔ قصّہ مختصر انسان عقل کا پتلا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ اِس کی عقل کو بیل کی دُم کی طرح اپنے ہاتھ میں پکڑنا چاہیں اور وہ آپ کے ہاتھ میں نہ آسکے۔

انسان جو سب سے بڑی چالاکی اپنے ساتھ اور دوسروں کے ساتھ کرتا ہے وہ یہی ہے کہ عموماً اُسے جہاں عقل استعمال کرنی چاہیے وہاں وہ عقل استعمال نہیں کرتا بلکہ بڑے سلیقے سے اپنی ذات سمیت سب کو "غچہ" دے جاتا ہے۔ آپ سر پیٹ کر رہ جاتے ہیں کہ ہائیں یہ کیا کر ڈالا ذرا عقل استعمال کی ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔ لیکن اُس کے کان پر جُوں تک نہیں رینگتی، آخر وہ اپنی عقل استعمال کیوں کرے؟ اُس کی عقل کا ایک "ذرّہ" بھی کیوں خرچ ہو؟ شاید انسان عقل استعمال کرتے ہوئے اِس لیے ڈرتا ہے کہ یہ ایک بے بہا دولت ہے۔ استعمال میں آگئی تو اس کی کوئی قیمت "مقرر" ہو جائے گی اور وہ یہ نہیں چاہتا کہ جس چیز کی کوئی قیمت نہیں لگائی جاسکتی اُس کی کوئی قیمت لگائی جائے۔ گویا ہر شخص کے پاس عقل کا ایک بے حساب خزانہ موجود ہے جس پر وہ سانپ بن کر بیٹھا ہے۔ اِسے نہ خود استعمال کرتا ہے اور نہ کسی کو استعمال کرنے دیتا ہے۔

میں خالص عقل کی بات کر رہا ہوں۔ عموماً لوگ ہر اُلٹی سیدھی بات کو عقل سمجھنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر چوری کرنے کو بھی عقل کہا جاتا ہے۔ کسی کو دھوکہ دینا بھی عقل میں شمار ہوتا ہے۔ مکّاری، عیّاری اور جھوٹ بولنا بھی عقل کے مساعئ جمیلہ میں سے چند مساعی کہے جاتے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں چوری، مکّاری، عیّاری اور جھوٹ وغیرہ میں ہزار سلیقے سے کام لیں،

لیکن وہ عقل نہیں کہلائے جاسکتے۔ اِن حرکات کو آپ خواہ کچھ نام دیں، ان کا عقل سے دُور کا رشتہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ چوری، عیّاری اور جھوٹ وغیرہ تو پھر بھی (خواہ غلطی ہی سے سہی) اخلاقِ ذمیمہ میں شمار کیے جاتے ہیں، اِن میں عقل کا عمل دخل کیسے ہوسکتا ہے، اکثر اوقات فلسفہ و حکمت بھی عقل سے عاری رہ جاتے ہیں۔ لٰہذا یہ ضروری نہیں کہ اگر ایک شخص فلسفہ و حکمت سے کام لیتا ہے، تو وہ عقل بھی استعمال کر رہا ہے۔ عقل اور اُس کا استعمال بہت نازک کام ہے۔ موٹی سے موٹی عقل بھی حد درجہ لطیف ہوتی ہے، غالبًا یہی وجہ ہے کہ جب لوگوں سے پوچھا جاتا ہے عقل بڑی یا بھینس؟ تو اُنھیں اِس سوال کے جواب میں بھینس ہی بڑی نظر آتی ہے ۔۔ جس طرح کسی ایٹم کے اجزا ایک عام نگاہ کے متحمل نہیں ہوسکتے اور جونہی آپ اُن پر نظر ڈالتے ہیں وہ اپنی ہئیت بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ اِسی طرح عقل کا بھی معاملہ ہے، ذرا کسی کی نیّت میں فرق واقع ہوا اور عقل نے اپنی ہئیت بدلی۔ چنانچہ عقل استعمال کرنے سے قبل نیّت کے مُنھ میں لگام دینا نہایت ضروری ہے۔ کہتے ہیں عقل کی خرابی نیّت کی خرابی سے ظہور میں آتی ہے۔ نیّت بحال رہے تو عقل بے حال نہیں ہوتی۔

میں ذاتی طور پر عقل اور نیّت میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا۔ اِسی لیے نیک نیتی کی بنا پر انسان سے جو حماقتیں سرزد ہوتی ہیں وہ بھی میرے خیال میں کم عقلی کی دلیل نہیں ہوتیں لوہے کی طرح عقل کے ساتھ بھی ایک مصیبت یہ ہے کہ اگر اُسے استعمال نہ کیا جائے، تو زنگ لگ جاتا ہے۔ حد سے زیادہ استعمال میں آجائے تو اس کی دھار تیز ہوجاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں حماقتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ زنگ آلودہ عقل کی حماقتیں بڑی بے ذائقہ اور پھُس ہوتی ہیں ۔۔۔ تیز دھار والی عقل کی حماقتوں کے نتیجے میں انسان اپنے پرائے کی تمیز کھو بیٹھتا ہے جس سے خود اُس کی ہلاکت اور اُس کے خیر خواہوں کی ہلاکت کے سو فی صد امکانات پیدا ہوجاتے ہیں، چنانچہ

توازن کے ساتھ عقل کا استعمال اُس کا صحیح استعمال ہے۔ اب چونکہ یہ کام خاصا مشکل ہے۔ اس لیے عموماً لوگ یا تو عقل کو سرے سے استعمال ہی نہیں کرتے یا اگر استعمال کرتے ہیں تو حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ اور یوں چار دانگِ عالم میں حماقتوں کا ڈنکا بجتا رہتا ہے۔

ہمارے ایک دوست کہا کرتے ہیں "اگر عقل کا مُنھ کالا کرنا ہے، تو اُسے اپنی ذات تک محدود کر دیجیے ــــ طمع، لالچ اور خود غرضی سے بڑھ کر عقل کے لیے کوئی سیاہی نہیں اور اگر اُس کا چہرہ منور کرنا مقصود ہے، تو اُسے دوسروں کے لیے استعمال میں لا کر دیکھیے ہمدردی سے بڑھ کر عقل کے لیے کوئی جِلا نہیں" ــــ میں اس کے جواب میں کہا کرتا ہوں "عقل کا مُنھ کبھی کالا نہیں ہو سکتا، کیونکہ کوئی صاحبِ عقل طمع اور لالچ سے کام لینا پسند نہیں کرے گا۔ البتہ عقل کا چہرہ روشن سے روشن تر ضرور ہو سکتا ہے۔ ہر عقل والا ہمدردی اور غم خواری کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے عقل کو استعمال میں کون لائے؟ ساری قباحت، تو اِس میں پوشیدہ ہے کہ انسان جلدی سے عقل کو استعمال کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ عقل استعمال میں آجائے تو تمام مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ بہر حال میں نے نسخہ تجویز کر دیا ہے، استعمال کی ذمہ داری آپ پر ہے۔ ویسے میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ عقل کے حوالے سے نسخہ ہر کوئی تجویز کر سکتا ہے اصل مسئلہ تو اُس کے استعمال کا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عقل کا استعمال ہی انسان کی اصل آزادی ہے۔ کوئی ہزار نسخے تجویز کرتا پھرے آپ کریں گے وہی جو آپ کی مرضی ہوگی۔

جوہر کا المیہ

اگر آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ زندگی کی ہر مصیبت المیہ نہیں ہوتی، تو پھر آپ اِس حقیقت کو بھی ضرور مان لیں گے کہ عام طور پر بڑے سے بڑے انسانی المیے کا آغاز معصومیت سے ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بھولا بھالا ہونا جوہرِ قابل کی فطرت میں داخل ہے۔ اُسے مکاری اور عیاری سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ زندگی اُس کے سامنے ایک سیدھی لکیر کے مانند ہوتی ہے۔ اُس کی لُغت میں مُشکل کا لفظ کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ اُس کے خیال کے مطابق ہر قسم کی مشکلات کے پیچھے ہمیشہ دو سبب ہوتے ہیں۔ ایک ریاکاری اور دوسرے کم ہمتی انسان کے مکر و ریا نے زندگی کو مشکل بنایا اور اِس مشکل کو برقرار رکھنے والی چیز اُس کی کم ہمتی ہے۔ (واضح رہے کہ قدرت کی طرف سے پیدا ہونے والی دُشواریاں انسان کو اتنا بددِل نہیں کرتیں جتنا کہ انسانی عیاریوں کی پیدا کردہ مشکلات اُسے پریشان کرتی ہیں) جوہر نہ ریاکار ہوتا ہے اور نہ کم ہمت، اِسی لیے اُسے زندگی مشکل نظر نہیں آتی۔ یہیں سے اُس کے المیے کا آغاز ہوتا ہے۔ دراصل عام مفہوم میں وہ حقیقت پسند نہیں رہتا۔

لوگ کہتے ہیں زندگی بڑی کٹھن ہے۔ وہ حیران ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھتا ہے۔ اُسے زندگی میں زنگارنگی تو ضرور دکھائی دیتی ہے، لیکن دُشواری کہیں دُور دُور بھی نظر نہیں آتی۔

چونکہ جوہر خود خالص اور اصل ہوتا ہے، اُسے اپنے سے باہر بھی خلوص اور صداقت کے سوا اور کچُھ نظر نہیں آتا ــــ خلوص اور صداقت نے اُس کی نگاہوں میں اس قدر نوُر بھر دیا ہوتا ہے کہ وہ نہایت آسانی سے انسانی عیّاریوں کی دبیز دُھند کے آر پار دیکھ لیتا ہے بلکہ اِس دُھند کا اُسے احساس تک نہیں ہوتا۔ جوہر کو ہر چیز صاف و شفّاف نظر آتی ہے لوگ اُسے دھوکہ دیتے ہیں، اُس کے گرِد ریاکاری کا جال بُنتے ہیں، اُسے پریشان کرتے ہیں اور وہ اپنی اُسی روایتی حیرت اور معصومیّت کے ساتھ لوگوں کو پکار پکار کر کہتا ہے "میرے پیارو! میرے عزیزو! تمہیں یہ کیا ہوگیا ہے؟ کیسی باتیں کرتے ہو؟ ذرا اپنی فطرت، اپنی اصلیت پر ایک نگاہ تو ڈال کر دیکھو، تم کس قدر نورانی ہو، رخشندہ ہو، دل کش ہو، خوُب رو ہو۔ قسم ہے جمالِ زندگی کی! تمہاری رعنائیوں، زیبائیوں اور دلبرائیوں کا کوئی جواب نہیں" لوگ یہ سُن کر ایک بھرپُور قہقہہ لگاتے ہوئے اُس سے کہتے ہیں "خوشامدی کہیں کے! ہمیں بے وقوف بناتا ہے!" وہ پھر انکسار آمیز لہجے میں انھیں جواب دیتا ہے "نا میرے دوستو! مجھ سے ناراض مت ہو ــــ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تو اچھی طرح لفظِ خوشامد کے معنی بھی نہیں جانتا ــــ جو محسوس کرتا ہوں زبان پر لے آتا ہوں۔ البتّہ تم یہ کہو تو بالکل درست ہے کہ میں بے خبر ہوں۔ خوشامدی سے تمہاری کیا مراد ہے؟ یقین جانو مجُھے کچُھ معلوم نہیں۔

بظاہر دیکھنے میں جوہر اس حد تک سادہ لوح ہوتا ہے کہ آپ اُسے جو کچھ کہتے ہیں وہ مان لیتا ہے ــ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ــــ وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا مُنکر ہوتا ہے ــــ اُس کا اِنکار عہدِ رواں کی جملہ سطحی اور نام نہاد قدروں کو اس وثوق سے بے معنی قرار دیتا ہے کہ اہلِ زمانہ مُنھ تکتے رہ جاتے ہیں۔ وہ بار بار اپنے رویّے سے اِس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ دُنیا میں خیر ہی خیر ہے۔ شر کا کوئی وجود نہیں۔ آپ جوہر کے اِس یقین پر

جھنجلا اُٹھتے ہیں: بے وقوفی کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ دُنیا میں ابھی تک جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کا اصول چل رہا ہے اور یہ حضرت کہتے ہیں" ایسی کوئی بات نہیں صرف سمجھنے کا فرق ہے۔ جن کے پاس لاٹھی ہوتی ہے وہ بھینس کو بہت کچھ سمجھتے ہیں؛ چنانچہ اُس کے حصول کے لیے بے قرار ہو جاتے ہیں، جن کے پاس لاٹھی نہیں ہوتی یا جو لاٹھی میں ضرورت سے زیادہ یقین نہیں رکھتے، اُن کی نظر میں بھینس صرف بھینس ہوتی ہے۔ لاٹھی ہاتھ میں آجانے کا عموماً سب سے بڑا نقصان یہی ہوتا ہے کہ آدمی غیر اہم چیزوں کو اہم سمجھنے لگتا ہے۔" لوگ جوہر کے استدلال سے تنگ آکر خود اُس کے سر میں لاٹھی دے مارتے ہیں۔ اُن کا خیال ہوتا ہے کہ اس طرح وہ جوہر کو قائل کرلیں گے۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ جوہر لہولہان ہونے کے باوجود اُن کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے، اُن کے حق میں دُعائیں کر رہا ہے، تو اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

جوہر صرف خیر کو حقیقت کا درجہ دیتا ہے۔ آپ اُسے دُنیا کے نام نہاد سنگین حقائق کا ہزار احساس دلاتے رہیں وہ اُن میں سے کسی ایک کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جوہر کو تکلیفیں پہنچتی ہیں، بے شمار نقصان اُٹھانے پڑتے ہیں، لیکن وہ اِن تکالیف اور نقصانات کو حقائق سے تعبیر نہیں کرتا۔ وہ سمجھتا ہے یہ سب کچھ غلط فہمی کی بنا پر ہو رہا ہے — فریب، دغا، مکاری، بددیانتی، بغض و عناد اور اِس قبیل کی دوسری تمام بُرائیاں کوئی وجود نہیں رکھتیں۔ یہ سب ہماری سمجھ کا قصور ہے۔

جوہر کی دانست میں خیر کو اصل حقیقت ماننا سب سے بڑا ایمان ہے اور خیر کی حقیقت سے انکار کرنا سب سے بڑا کفر — وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ خیر کے اقرار سے امن و آشتی پرورش پاتے ہیں اور اِس کے انکار سے فساد برپا ہوتا ہے۔ اقرارِ خیر کے ضمن میں

اگرچہ دُنیا نے زیادہ تر لفظوں سے کام لیا ہے اور عملی اعتبار سے بہت کم قدم اُٹھائے ہیں، لیکن اِس کے باوجود دنیا میں جتنی کچھ نظم و ترتیب کی نظر آتی ہے، یہ سب خیر کے زبانی اقرار کا نتیجہ ہے۔ جس روز اقرارِ خیر کے ساتھ ساتھ انسان کے قدم بھی اُٹھنے لگے تو سمجھ لیجیے دُنیا ہی میں جنّت کا قیام عمل میں آنے لگا ہے۔

دُنیا کی نظر میں جوہر کبھی کامیاب نہیں ہوتا، لیکن اپنی ہزار ناکامی، خرابی اور تباہی کے باوجود وہ اعتبار کی شمعیں روشن کرتا رہتا ہے۔ اعتبار زندگی کی اساس ہے جسے یہ نصیب ہو جائے وہ زندگی کی حقیقت کو پا لیتا ہے۔ بے یقینی کے عالم میں زندگی کی حقیقت و صداقت کا پتہ چلانا تو ایک طرف رہا، ہم پر اُس کے جھُوٹ بھی ظاہر نہیں ہوتے۔ بے اعتبار آدمی کو زندگی کا صرف ایک پہلو نظر آتا ہے اور وہ بھی ہلکا سا۔ با اعتبار آدمی کے سامنے زندگی کا ہر رُخ ہوتا ہے۔ اعتبار انسان میں زندگی کو سمجھنے کی وسعت و ہمّت پیدا کرتا ہے۔ جوہرِ قابل کی سب سے بڑی تمنّا یہی ہوتی ہے کہ جس طرح بھی ہو لوگوں میں اعتبار کا نُور عام ہو جائے۔ بے یقینی اور مایوسی، ہوس بھی ہے اور جہالت بھی۔ جوہرِ قابل زندگی کے اِن دو بڑے دُشمنوں سے انسان کو محفوظ رکھنے کی سعی میں اپنا سب کچھ نثار کر دیتا ہے۔ اب یہ بالکل الگ مسئلہ ہے کہ جوہر کی اِس قُربانی پر لوگ عموماً اِس طرح قہقہہ لگاتے ہیں جیسے وہ کہہ رہے ہوں۔

"تمہیں ہوس اور جہالت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔"

منافق

شاید میں اس عہد کے بڑے منافقوں میں سے ایک ہوں۔ شاید کا لفظ میں نے "تکلفاً" استعمال کیا ہے۔ کیونکہ بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ بڑائی خواہ کسی قسم کی ہو اُس کا اظہار کرتے وقت انسان کو کسرِ نفسی سے ضرور کام لینا چاہیے۔ اگر آپ اپنے زمانے کے کسی بڑے چور یا ڈاکو کو تعریف کے طور پر یہ کہہ دیں کہ صاحب! آپ کے کیا کہنے ماشاء اللہ آج تک دُنیا میں آپ سے بڑا ڈاکو پیدا نہیں ہوا، تو فوراً شرما کر کہے گا "جناب میں کس قابل ہوں۔ چوری اور ڈاکے تو میرے آباؤ اجداد مارا کرتے تھے۔ مرحوم دادا جان نے دن دہاڑے شہر کے شہر لوٹے ہیں۔ خدا اُنھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔" اسی طرح اگر آپ کسی معیاری غنڈے کو کہیں کہ بھئی آپ تو بہت بڑے غنڈے ہیں، تو وہ بھی نظریں جھکا کر یہی جواب دے گا کہ "بابوجی! اب غنڈہ بننے میں کچھ نہیں رکھا۔ آج کل تو غنڈہ گردی شرافت بنتی جارہی ہے اور غنڈے سالے بھی اپنے آپ کو شریف کہلا کر خوش ہوتے ہیں" غرض بڑائی کے اظہار میں عجز وانکسار سے کام لینا ہماری اخلاقی روایت بن چکا ہے، اسی روایت کے تحت میں نے خود کو بڑا منافق کہتے وقت لفظ شاید کا اضافہ ضروری سمجھا۔

میں اپنے زمانے کا بہت بڑا منافق ہوں۔ کیوں؟ اس لیے کہ میں ہر وقت اور

ہر جگہ منافقت سے کام لینا چاہتا ہوں۔ اگر کسی وقت مجھے منافقت سے کام لینے کا موقعہ نہیں ملتا، تو میری طبیعت بے چین ہو جاتی ہے۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ مجھے عجیب قسم کی گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے منافقت کے بغیر میں ایک لمحہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ ـــــــــــــــــ منافقت میرے جسم و رُوح کی غذا ہے۔ میری زندگی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں زندہ رہوں اور منافقت نہ کروں لیکن اس تمام اضطراب اور بے چینی کے باوجود میں اکثر و بیشتر منافقت کرنے سے محروم رہ جاتا ہوں۔ معاف کیجیے۔ ہمارا زمانہ بے حسی اور بے غیرتی کا زمانہ ہے ہم جو چاہتے ہیں اُس پر عمل نہیں کرتے، ہم میں جرأت و ہمت کی بُری طرح کمی واقع ہو گئی ہے۔ اسی فقدان جرأت کے باعث میں بھی عموماً منافقت کے سُنہری موقعے ہاتھ سے گنواتا رہتا ہوں۔

تاہم میں اپنے عہد کا بہت بڑا منافق ہوں۔ میری منافقت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں اپنے منافقانہ رویّے کو احباب و اقربا کے ساتھ بھی جوں کا توں روا رکھتا ہوں بلکہ مجھ سے کوئی جتنا قریب ہوتا ہے اُسی قدر وہ میری منافقت کا نشانہ بنتا ہے ویسے اگر سچ پوچھا جائے تو منافقت میرا ایمان ہے۔ اس کے بغیر تو میں سرے سے ملنا جلنا ہی حرام سمجھتا ہوں۔ ملے تو آدمی منافق ہو کر ملے ورنہ خالص میل جول سے تو تنہا بیٹھنا لاکھ درجہ بہتر ہے۔ تنہائی میں آدمی کو غیر سے نہ سہی کم از کم اپنے آپ سے تو منافقت کرنے کا موقع ہاتھ لگ جاتا ہے۔

یقین کیجیے میں بہت بڑا منافق ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں اپنے منافق ہونے کا بار بار اعلان بھی کر رہا ہوں اور مجھے شرم بھی نہیں آ رہی ہے۔ لیکن کیا آپ کو معلوم نہیں کہ منافقت سے کبھی شرم کا کوئی رشتہ قائم نہیں ہوا ـــــ یہ دونوں، تو ایک دوسرے کی ضد ہیں

اور بے حیائی منافقت ہی کا دوسرا نام ہے۔ بہرحال مجھے شرم نہیں آتی۔ میں منافقت پر منافقت کیے جاتا ہوں اور اپنے کیے پر ذرا نہیں پچھتاتا۔ شاید اس لیے کہ پچھتانا نہ صرف بزدل اور ڈرپوک لوگوں کا کام ہے۔ بلکہ یہ فعل انسان کی حماقت اور کم علمی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اپنی کسی غلط بات پر اڑے رہنا پچھتانے سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔

بات بڑی نجی سی ہے۔ تاہم عرض کیے دیتا ہوں۔ میری منافقت کا باعث ایک بہت ہی پرانا اور دقیانوسی خیال ہے۔ آپ نے لوگوں کو خصوصاً دقیانوسی لوگوں کو اکثر کہتے سنا ہوگا کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ بس جناب اس خیال نے مجھ پر یہاں تک اثر کیا کہ میں کٹر منافق بن بیٹھا۔ میرے لیے سارے فساد کی جڑ یہی خیال ہے۔ میں انسان کو خطا کا پتلا نہ سمجھتا تو منافقت کبھی میرے قریب نہ آتی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مجھے کسی شخص کی خطاؤں اور کوتاہیوں پر حیرت نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں جس طرح مجھ سے غلطی ہو سکتی ہے اسی طرح کسی دوسرے شخص سے بھی خطا کا ارتکاب عین ممکن ہے۔ میرے لیے سہو و خطا عجوبہ نہیں انسانی زندگی کے معمولات میں سے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ میں دوسروں کی خامیوں کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیتا۔ خاص نوٹس سے میری مراد یہ ہے کہ یوں تو مجھے دوسروں کی غلطیوں پر (اپنی غلطیوں سے زیادہ) افسوس بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھی میرے کان بھی کھڑے ہو جاتے ہیں، یعنی حیرت بھی ہوتی ہے، لیکن اس حیرت اور افسوس میں غیر معمولی پن قطعی نہیں ہوتا۔

میرا شعور انسانی کوتاہیوں پر اسی طرح بیدار ہوتا ہے جیسے صبح کی آمد ہمیں حسب معمول نیند سے بیدار کرتی ہے۔ میری اس بیداری میں وہ کیفیت نہیں ہوتی جس طرح ہم رات کو سوتے ہوئے کسی اچانک کھڑکھڑاہٹ پر جاگ اٹھتے ہیں، چنانچہ آپ میرے سامنے میرے عزیز ترین دوستوں اور رشتہ داروں کو برا بھلا کہتے رہیے، میں نہایت اطمینان سے سب کچھ سنتا رہوں گا۔ اسی

طرح اگر کسی موقعہ پر کوئی آپ کی شان میں "قصیدہ خوانی" فرمائے گا، تو مجھے اُس کے گوش گزار کرنے میں بھی کوئی عذر نہیں ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ پیارے سے پیارے عزیز اور دوست کی برائیاں سُن کر بھی میری غیرت نہیں جاگتی اور اگر کبھی ایسا ہوتا بھی ہے، تو دوسروں کو بہت کم اس کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ مجھ سے فرماتے ہیں "مشکور! تمہارا فلاں عزیز بدمعاش آدمی ہے"۔ اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میرا وہ عزیز بدمعاش آدمی نہیں ہے۔ لیکن اس علم و یقین کے باوجود میں براہِ راست آپ کی تردید نہیں کروں گا۔ آپ کی بات سُن کر پہلے مجھے کچھ تامّل ہو گا۔ پھر میں کھسیانا سا ہو کر ہنسنے کی کوشش کروں گا۔ آپ کی طرف دو چار بار دیکھوں گا بھی۔ بولنے کے لیے شاید مجھے گلا بھی صاف کرنا پڑے۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد فقط اتنا کہہ سکوں گا "آپ نے درست فرمایا، پہلے تو میرا وہ عزیز ایسا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن آدمی کو بگڑتے کیا دیر لگتی ہے"۔ میرے یہ الفاظ سُن کر آپ تو یہ سمجھیں گے کہ میں نے آپ کی تائید کر دی میں اپنی جگہ یہ سوچ کر مطمئن ہوں گا کہ میں نے آپ کو اپنا مافی الضمیر بھی سمجھا دیا اور شائستگی کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور انسان سے کسی وقت بھی غلطی ہو سکتی ہے، اس امکان کی بھی نفی نہیں کی، لیکن میرے خیال میں آپ کا یہ سمجھ لینا کہ میں نے آپ کی تائید کی ہے، زیادہ دُرست ہے۔ اور میرا رکھ رکھاؤ والا یہ تمام رویّہ غلط۔ کیوں؟ اس لیے کہ آج کی مصروف دُنیا میں ہر بات پر سوچ بچار کرنا، شائستگی کا خیال رکھنا، تضیع اوقات کے مترادف ہے۔ اگر میں ایسا ہی صاف گو اور حق پرست بننا چاہتا ہوں، تو مجھے چاہیے کہ میں فوراً آپ کی تردید کروں اور صاف جواب دوں کہ صاحب آپ غلطی پر ہیں۔ میرا عزیز بدمعاش آدمی نہیں ہے۔ بلکہ مجھے اس سے بھی زیادہ واضح انداز اختیار کرتے ہوئے آپ سے یوں کہنا چاہیئے "حضرت! میرا عزیز بدمعاش آدمی نہیں ہے۔ آپ خود بدمعاش آدمی معلوم ہوتے ہیں"۔

اب میرے اس جواب باصواب پر آپ کا ردِّ عمل کیا ہوتا ہے ؟ مجھے اس کی قطعی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ۔ لیکن کیا کیا جائے ۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں عموماً سیدھی بات نہیں کرتا ۔ اکثر یہی سوچتا رہتا ہوں کہ کسی کے آئینۂ دل کو ٹھیس نہ لگ جائے ۔ مجھے اس سنگین حقیقت کا ذرا احساس نہیں ہوتا کہ ہمارے عدیم الفرصت عہد میں اس طرح کی پاسداری اور لحاظ ، منافقت اور مکّاری میں شمار کیے جاتے ہیں ۔

ممکن ہے اس وقت آپ یہ سوچ رہے ہوں کہ میری آنکھوں میں بلا کا لحاظ ہے یا میں نے پاسداری کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے ۔ نہیں صاحب ایسی کوئی بات نہیں ہے ۔ اپنے دوستوں میں تو ایک اعتبار سے میں خاصا بدلحاظ آدمی مشہور ہوں ۔ مثلاً مجھے دوست بنانا آتا ہے لیکن دوستی نبھانی نہیں آتی ۔ لوگ میرے دوست تو اس لیے بن جاتے ہیں کہ میں اپنی حماقتوں اور بیوقوفیوں کا اظہار پہلی ملاقات ہی میں کر ڈالتا ہوں دو واضح رہے کہ یہ کام ایسا ہے جسے ہر بے وقوف آدمی بغیر کسی تکلیف کے سرانجام دے لیتا ہے لیکن میں بزعم خود اس خیال سے اپنی حماقتوں کا اظہار کرتا ہوں کہ بے وقوف اور احمق ہونے کا شرف بھی انسان ایسی اشرف المخلوقات ہی کو حاصل ہوا ہے ۔ کوّے اور اونٹ حماقتیں نہیں کیا کرتے ۔ لہٰذا اس مخصوص انسانی صفت کے اظہار سے کیوں گریز کیا جائے) غرض دوست ہر کوئی بنا سکتا ہے لیکن دوستی کو نبھانا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہے ۔ میرے بدلحاظ ہونے کی داستان یہیں سے شروع ہوتی ہے ۔ دوستی نبھانے کے معنی تو یہ ہیں کہ آپ اپنے دوست کی ہر حق اور ناحق بات کی حمایت کریں ، بلکہ حق بات سے زیادہ ناحق بات کی حمایت کریں ۔ ہم اپنے اُس دوست کو صحیح معنوں میں جرأت مند اور دلیر کہتے ہیں جو ہماری ناجائز باتوں کی کھلے بندوں حمایت کرتا ہے ، لیکن میں اس قدر کودن اور غبی واقع ہوا ہوں

کہ میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی۔ میں سوچتا رہتا ہوں کہ دوستوں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو آخر کیوں تسلیم نہ کیا جائے، اُن کی ناجائز بات کو کیسے جائز قرار دیا جاسکتا ہے دوستی کے معنی بے انصافی کیونکر بنائے جاسکتے ہیں۔ کیا اپنوں کی کوتاہیوں کو تسلیم نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اُنھیں ہمیشہ نقصان میں رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم اُن کے اخلاق و کردار میں کسی ارتقا کے خواہاں نہیں ہیں۔ میں تو جس طرح اپنے دشمن کی خوبیوں کی تعریف کرسکتا ہوں اسی طرح دوست کی خامیوں کو تسلیم کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ لیکن مطمئن رہیے میرے اس رویّے سے بھی میرے کردار کی کسی خوبی کا اظہار نہیں ہوتا۔ میری تو سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ میں کسی کے مُنھ پر اُس کی صحیح تعریف تو واضح الفاظ میں کر دیتا ہوں۔ لیکن اُس کی خامیوں کو ظاہر کرتے وقت خاصا محتاط ہو جاتا ہوں (آپ میری اس احتیاط کو بزدلی بھی کہہ سکتے ہیں)، غالبًا اس کی وجہ چند در چند ایسے تجربات ہیں جن میں مجھے اپنے خلوص نے خاصا پریشان کیا، مثلًا ایک دفعہ ایک صاحب کو میں نے نہایت اپنا سمجھتے ہوئے اُن کی ایک "بات" پر اُنھیں کمینہ کہہ دیا۔ لیجیے صاحب اُس دن سے وہ حضرت مُنھ سجائے پھرتے ہیں، حالانکہ میں فورًا اپنے اس اخلاص کی معذرت کے لیے اُن کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اس قسم کے واقعات سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ انسان کسی قیمت پر اپنی بُرائی سننا پسند نہیں کرتا، چنانچہ اُس کے سامنے اُس کی بُرائی کو بڑے سلیقے کے ساتھ ظاہر کرنا چاہیے۔ میرا یہی سلیقہ یا اس سلیقے کی کوشش منافقت بن جاتی ہے۔ کیوں؟ بات یہ ہے کہ سلیقے سے کہی ہوئی بات پر لوگ توجہ نہیں دیتے اور میں اُن کی واقعی خامیوں کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہتا، اب اگر وہ حاضر ہیں تو میں ڈرتے ہوئے اُن کی خامیوں کو تسلیم کرتا ہوں اور اگر وہ موجود نہیں ہیں، تو پھر ذرا تفصیل کے ساتھ تسلیم کی اس منزل سے گزر جاتا ہوں۔

ممکن ہے آپ میرا لحاظ کرتے ہوئے یہ فرمائیں کہ کسی کی خامیوں کے اظہار میں احتیاط کرنا، تو شائستگی کہلاتا ہے اور دوستوں کی کوتاہیوں اور دشمنوں کی خوبیوں کو تسلیم کرنا انصاف پسندی اور غیر جانبداری کی دلیل ہے۔ تو میں اس کے جواب میں یہ عرض کروں گا کہ آج کل انصاف پسندی اور غیر جانبداری ہی سب سے بڑی منافقت ہے۔ ادھر انصاف پسند آدمی اپنی بات بھی سُنانا چاہتا ہے اور لوگوں کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا۔ اس کشمکش سے نکلنے کے لیے اُس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سچی اور کھری بات کو براہِ راست نہ کہے۔ اب وہ غریب اس بات کو گھما پھرا کر بیان کرتا ہے اور اس عہد کے "معروف" لوگ اُسے منافق کے نام سے یاد کرنے لگتے ہیں۔ آپ فرمائیں گے "مشکور! تم خواہ مخواہ ایک سیدھی سادی بات کو توڑ مروڑ کر بیان کر رہے ہو، منافقت اس کو ہرگز نہیں کہتے منافقت کے معنی تو یہ ہیں کہ آدمی کہے کچھ کرے کچھ۔ اُس کے دل میں کچھ ہو زبان پر کچھ"۔ میں اس ضمن میں نہایت ادب کے ساتھ آپ کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کہنا کچھ اور کرنا کچھ یا دل میں رکھنا کچھ اور زبان سے کہنا کچھ منافقت نہیں ہے، یہ تو زندہ رہنے کا سب سے بڑا گُر ہے۔ بے چارے انسان نے یہ گُر اپنے ضمیر کو بصد مشکل ٹھنڈی میٹھی نیند سُلا کر حاصل کیا ہے، آپ اسے منافقت کا نام دے کر بنی نوع آدم کے سب کیے دھرے پر کیوں پانی پھیر دینا چاہتے ہیں۔ آج کی ساری تہذیب، سارے بین الاقوامی ادارے، سارے کاروبار، ساری ترقیاں محض اس گُر پر کاربند رہنے سے قائم ہیں۔ اگر انسان اس گُر کا استعمال ترک کر دے، تو چشمِ زدن میں یہ تمام رونقیں تباہ و برباد ہو جائیں۔ کیا آپ دُنیا کی تباہی چاہتے ہیں جو ایسے حیات افروز گُر کو منافقت ایسی مکروہ چیز کا نام دے رہے ہیں۔

اجی جناب! اصل منافقت، تو انصاف پسندی ہے، جس میں آپ کو دوست اور دشمن کی تمیز نہیں رہتی ___ جس طرح آپ دوست کی خامیاں اور کوتاہیاں دیکھ اور سُن سکتے ہیں اِسی طرح دشمن کی خوبیوں کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے زمانے میں اِسی کو منافقت کہتے ہیں ____
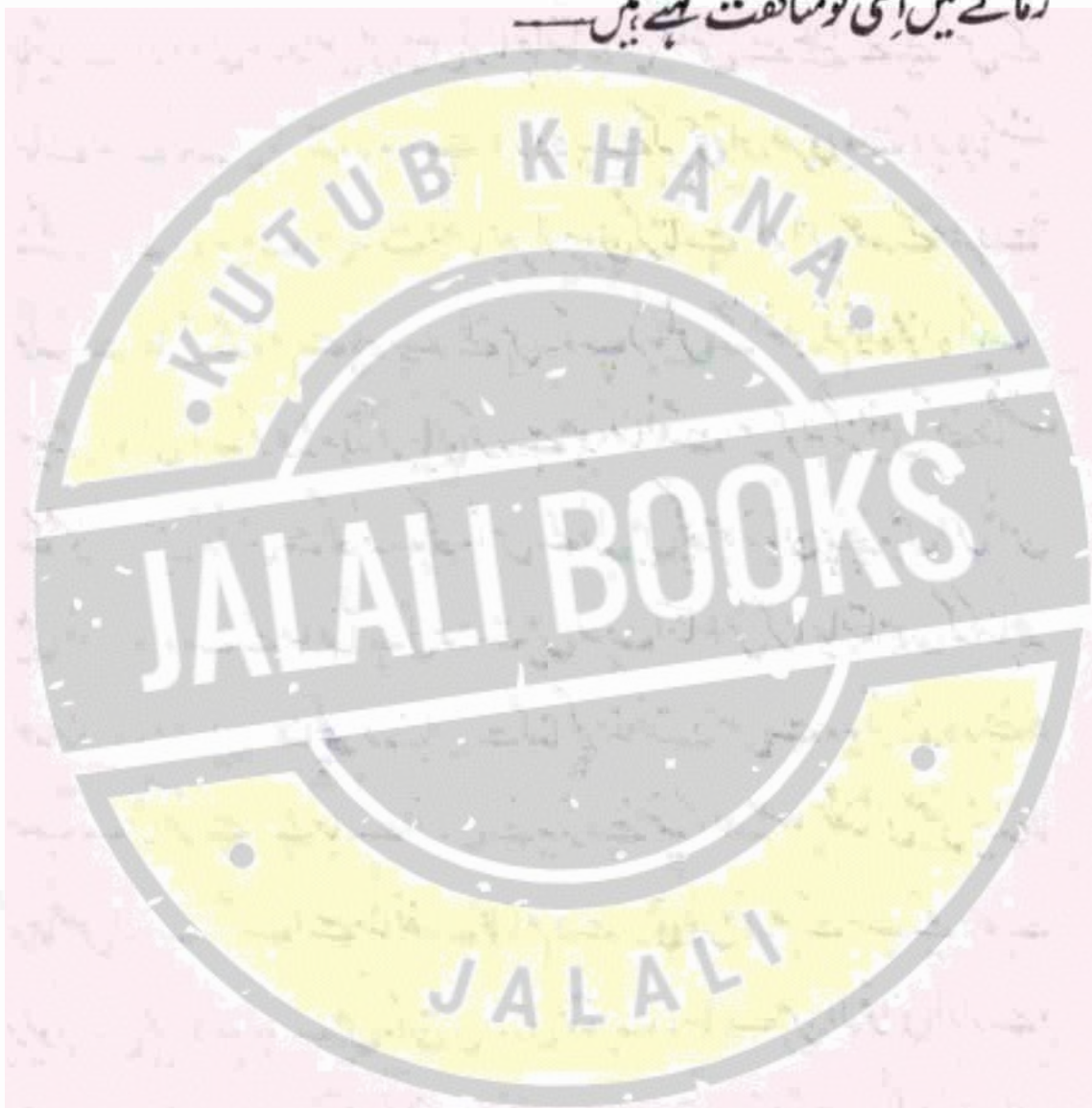
سر کے بل

آدمی پاؤں کے بل چلنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن آج تک اُسے پاؤں کے بل چلنا نہیں آیا۔ وہ اس میں کبھی کامیاب بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر اسے پاؤں کے بل چلنا آجائے تو وہ پتھر کا ہو کر رہ جائے۔ البتہ آدمی کو سر کے بل چلنا آتا ہے اور اسی سے وہ چِڑتا ہے۔ اُسے پاؤں کے بل چلنے میں آسانی نظر آتی ہے، حالانکہ جیسا ابھی عرض کیا ہے، پاؤں کے بل چلنا ایک ناممکن سی بات ہے، لیکن بے چارہ آدمی بھی کیا کرے۔ ناممکن باتیں ہی، تو آسان نظر آیا کرتی ہیں۔ ممکنات پر یقین رکھنے والے لوگ مشکل پسند ہوتے ہیں اور ناممکنات کے چکر میں پھنسنے والے تن آسان — زندگی کی دشواریوں کو وہی افراد سینے سے لگاتے ہیں جنہیں ہر طرف امکانات کی کرنیں پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں۔

کسی کو اپنے قد کا بھرپور احساس کرنا ہو، تو اُلٹا لٹک کر دیکھے۔ کہتے ہیں کہ سر نیچے اور پاؤں اُوپر ہوتے ہی چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ چودہ طبق روشن ہوتے ہوں یا نہ ہوتے ہوں، کم از کم انسان کو اپنے قامت کا ضرور پتہ چل جاتا ہے۔ یوں اگر ہم اپنا قد معلوم کرنا چاہیں، تو اس خواہش کی تکمیل کے لیے ہمیں غیر ذات کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ ایک پول ہو جس پر انچوں اور فٹوں کے نشان ہوں۔ اگر یہ پول نہ ہو، تو کوئی دیوار ہو جس کے ساتھ لگ

کر ہم کھڑے ہو سکیں۔ علاوہ ازیں ایک شخص ہو جو ہماری کھوپڑی کو پنسل یا کسی اور چیز سے چھوتے ہوئے

اس پول یا دیوار پر نشان لگا سکے۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد ہمیں اپنے قد کے بارے میں علم حاصل ہو گا اور

وہ بھی فٹوں اور انچوں میں۔ پھر فٹوں اور انچوں کا یہ علم ہمیں اس احساس سے آشنا نہیں کر سکتا جو

احساس ہمیں سر کے بل کھڑے ہو کر اپنے پیکر کو دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے ۔۔۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عرفانِ ذات

حاصل کرنے کے لیے اُلٹا لٹکنا نہایت ضروری ہے۔

یہ بات کسے معلوم نہیں کہ سر نیچے اور پاؤں اُوپر کر لیے جائیں، تو خون کا دوران سر کی طرف زیادہ ہو جاتا ہے اور خون کی زیادتی دماغی قوتوں کے اضافے کا باعث بنتی ہے۔ یوں بھی خون کہاں قوت نہیں بخشتا۔ دماغی صحت اور عام توانائی کے خواہش مند ہو، تو اُلٹا لٹکو۔

دُنیا میں اُلٹا لٹکنے سے بہتر کوئی کام نہیں۔ اس کارِ خیر کی قدر و قیمت سے کچھ وہی لوگ آگاہ ہیں جو اُلٹا لٹکتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں جسے اُلٹا لٹکنے کی عادت ہو جائے، کامیابی اس کے قدم چومتی ہے ۔۔۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اُلٹا لٹکنا ایک نشہ ہے۔ جسے اس کا چسکا پڑ جاتا ہے اُسے اُلٹا لٹکے بغیر چین نہیں آتا۔ اُلٹا لٹکنے کو ایک سعادت بھی شمار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ سعادت زورِ بازو سے تعلق رکھتی ہے، لیکن پھر بھی ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔

اُلٹا لٹکنا ہر حال میں مستحسن ہے ۔۔۔ راحت ہو یا مصیبت اُلٹا لٹکے بغیر بات نہیں بنتی۔ دونوں کیفیتوں کا صحیح لطف تنہا اسی فعل میں موجود ہے۔ راحت میں اُلٹا لٹک کر ہم مسرت کے بلند سے بلند مقام کو حاصل کر سکتے ہیں اور مصیبت میں اُلٹا لٹکنا بصیرت سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ (واضح رہے کہ اُلٹا لٹکنا بذاتِ خود مصیبت نہیں، یہ تو مصیبت اور راحت کو عینِ زندگی بنانے کی ورزش کا نام ہے)

کائنات کے بارے میں تین بڑے مشہور نظریات سے، تو آپ بخوبی واقف ہوں گے:

پہلا نظریہ یہ ہے کہ ساری کائنات پاؤں ہی پاؤں ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ کائنات سر ہی سر ہے اور تیسرا نظریہ یہ ہے کہ کائنات نہ صرف پاؤں ہے اور نہ صرف سر، بلکہ پاؤں میں سر اور سر میں پاؤں کچھ اس طرح گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ سر اور پاؤں کی تمیز ناممکن سی ہو گئی ہے۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ کائنات کا نہ کوئی سر ہے نہ پاؤں، چنانچہ اسی بے تُکے پن کی بُنیاد پر کبھی سر سے پاؤں نکل آتا ہے اور کبھی پاؤں سے سر۔۔ بہرحال وجوہات کچھ ہوں، یہ حقیقت ہے کہ سر اور پاؤں کو دو الگ الگ چیزیں تسلیم کر لیا گیا ہے۔ جو چیز ساکن ہے وہ پاؤں ہیں۔ جو چیز انھیں اپنے منشا کے مطابق اِدھر اُدھر لے جاتی ہے، وہ سر ہے۔ بظاہر پاؤں چلتے نظر آتے ہیں، لیکن حقیقت میں سر چلتا ہے۔

مادّہ کو تسخیر کرنے کی ہوس میں عموماً انسان خود اس سے مسخر ہو جاتا ہے اور اصل حقیقت اسی کو سمجھنے لگتا ہے۔ میں نے اسی ناسمجھی کو اس مضمون میں پاؤں کے بل چلنے سے تعبیر کیا ہے۔

سمجھدار آدمی ہمیشہ سر کے بل چلنے کی کوشش کرتا ہے اور اسی لیے اس کی بیشتر زندگی اُلٹا لٹک کر گزرتی ہے۔ عقل و دانش سے بھی لوگ اسی لیے دُور بھاگتے ہیں کہ وہ اُنھیں اُلٹا لٹکا دیتی ہے۔ میں یہ مشورہ تو ہرگز نہیں دوں گا کہ آپ پوری طرح سمجھدار آدمی بن جائیں اور اپنی ساری زندگی اُلٹا لٹک کر گزار دیں۔ البتّہ اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ اس حد تک سمجھدار ضرور ہو جائیے کہ سر اور پاؤں کی تمیز ہمیشہ آپ کے پیشِ نظر رہے۔ اس امتیاز کی بدولت زندگی خاصے مزے سے گزرتی ہے اور انسان کے لیے اعتدال پالیسی بے بہا شے کا حصول ممکن ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ آئے، تو آزما کر دیکھ لیجیے۔

ناک پکڑنے کا عمل

میں سخت ناسمجھ واقع ہوا ہوں۔ میری ناسمجھی کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ میں زندگی میں خواہ مخواہ دشواریاں پیدا کرنے کو ایک بیکار سی بات خیال کرتا ہوں حالانکہ زندگی کی ساری چہل پہل انہی بے معنی قسم کی دشواریوں کے دم قدم سے ہے۔ عقلمندوں کا کہنا ہے کہ سیدھے طور پر ناک پکڑنا انسان کا کام نہیں، صحیح معنوں میں انسان زادہ وہی ہے جو ہاتھ گھما کر اپنی ناک پکڑتا ہے۔ میں نے ہمیشہ ناک سیدھی طرح پکڑی اور لوگوں نے ہمیشہ میرا مذاق اُڑایا — ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ لوگوں کے کہنے کے مطابق میں گردن کے پیچھے سے ہاتھ لا کر اپنی ناک پکڑتا اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تھا تو اِسے کاٹ ڈالتا، لیکن میرے ساتھ یہ مشکل رہی کہ نہ تو میں ہاتھ گھما کر ناک پکڑ سکا اور نہ ہی مجھ میں اپنی ناک کاٹ ڈالنے کی ہمت پیدا ہوئی۔

ایک دن کا ذکر سُنیئے، میں اسی طرح سیدھے سادھے طور پر اپنی ناک پکڑنے میں مصروف تھا کہ اچانک مجھے عشق ہو گیا۔ اب تو میں نے یوں محسوس کیا گویا سادگی سے ناک پکڑنا زندگی کی سب سے بڑی عشرت ہے۔ چنانچہ فرطِ شوق سے بے تاب ہو کر کسی تکلف کے بغیر میں اپنے محبوب کے قریب جا پہنچا۔ محبوب کو میری اِس حرکت پر ہنسی آنے لگی تھی، لیکن اُس نے فوراً ضبط سے کام لیا۔ وہ گردن کے پیچھے سے ہاتھ لا کر اپنی ناک پکڑتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا:

"ارے تو کون ہے؟" میں نے سیدھی طرح اپنی ناک پکڑ کر جواب دیا: "تمہارا عاشق" بس پھر کیا تھا، میرے اِس جواب پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لوگوں کے ہاتھ گردن سے ہوتے ہوئے اُن کی ناکوں کی طرف آ رہے تھے۔ عجیب عالم تھا، سب کی آنکھوں اور مُنھ سے شعلے نکل رہے تھے اور کانوں سے دُھواں ___ موقع کی نزاکت کے پیشِ نظر احباب نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنا عشق واپس لے لُوں۔ چونکہ میں نے عشق کی ابتدا نہایت سادگی اور خلوص کے ساتھ کی تھی اِس لیے صاف طور پر کہہ دیا کہ میں عشق کو واپس لینے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ میں اپنی ضد پر پُوری طرح قائم ہوں تو مجھے رنگ رنگ کے مشورے دینے شروع کر دیے۔ ان مشوروں میں اتنا اثر ضرور تھا کہ میں اُنھیں بیک نگاہ رد نہ کر سکا۔ مثلاً جب میں نے چاہا کہ اپنے محبوب کے سامنے محبت کا اظہار بے تکلفی سے کر ڈالوں، تو لوگوں نے مجھ سے کہا: اس طرح محبت کا اظہار کرنا گنوار پن ہے۔ مجھے چاہیے کہ میں شعر کہنا شروع کر دوں؛ چنانچہ میں نے شاعری شروع کر دی ___ شعر کہہ کر محسوس ہوا جیسے میری بات ہمیشہ ادھوری رہتی ہے۔ تکمیلِ ابلاغ کا وُہ پُر لطف احساس جو مجھے محبوب سے براہِ راست اظہارِ عشق کرنے میں آیا تھا پھر کبھی حاصل نہ ہوا، حالانکہ میں نے محبوب کے استفسار پر کہ میں کون ہوں صرف یہ دو لفظ ہی، تو زبان سے ادا کیے تھے "تمہارا عاشق"۔ میں پے درپے شعر کہہ کر شاعر ضرور مشہور ہو گیا، لیکن میرے عشق پر خاک پڑ گئی۔ عمدہ سے عمدہ شاعری کر کے یہی محسوس ہوتا جیسے میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہاتھ گھما کر اپنی ناک پکڑ رہا ہوں ___ مجھے اپنے اِس احساس پر سخت اذیت ہوتی۔ میں نے کرب سے چیخنا شروع کر دیا، چونکہ میری آہ و زاری میں بے تکلفی اور خلوص تھا اِس لیے مجھے اِس طرح آہیں بھرنے میں یک گونہ طمانیت حاصل ہوئی۔ لیکن ابھی دو چار آہیں ہی کھینچ پایا تھا کہ دوستوں نے پھر مشورے دینے شروع کر دیے۔ "دیکھو یار! اِس طرح آہیں بھرو گے تو بیکار جان

سے ہاتھ دھو بیٹھو گے اور تمہارے محبوب کو خبر تک نہ ہو گی۔" میں نے پوچھا: "تو پھر دوستو! بتاؤ میں کیا کروں؟" اُنھوں نے کہا: "اگر آہیں بھرنا بہت ہی ضروری سمجھتے ہو تو بہتر یہ ہے کہ گانا شروع کر دو۔ تمہاری آہیں نغموں میں ڈھلیں گی، تو دُنیا والے عش عش کر اُٹھیں گے، تمہارا محبوب بھی تمہارے نغمے سُن کر سر دُھنے گا۔" میں نے اپنی آہوں کو سُروں میں ڈھالنا شروع کر دیا۔

میں ایک موسیقار مشہور ہو گیا، لیکن موسیقار بن کر بھی یہی محسوس ہوا جیسے میں آوازوں کے زیر و بم میں گم ہو کر رہ گیا ہوں اور میری صدائے دردناک میرے محبوب کے کانوں تک بالکل نہیں پہنچ رہی ہے۔ اس ناکامی کے احساس کی بدولت میری آنکھوں سے خون کے آنسو برسنا شروع ہو گئے۔ دوستوں نے دیکھا، تو پھر پریشان ہو کر بولے: "اُف یہ کیا غضب کر رہے ہو۔ خون کو اس طرح ضائع کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟" میں نے جواب دیا: "خُدا کے لیے مجھے پریشان نہ کرو۔ اِس طرح خُون کے آنسو بہانے میں بڑا لُطف آ رہا ہے۔ یہ بھی یقین سا ہو چلا ہے کہ اِن آنسوؤں سے میرا محبوب ضرور متاثر ہو گا۔" دوستوں نے پھر قہقہے لگائے۔ مجھے سمجھایا: "پاگل نہ بنو، خون ہی بہانا مقصود ہے، تو بُرش ہاتھ میں سنبھالو اور مصوّر بن جاؤ۔" اِس مشورے کے مطابق میں ایک مصوّر بھی بن گیا۔ بے شمار تصویریں بنا ڈالیں، لیکن احساس پھر بھی یہی رہا جیسے میں جو کچھ کر رہا ہوں سب تصنّع اور بناوٹ ہے۔ دل سے مسلسل آواز آ رہی تھی: "محبوب سے وصل کا واحد طریقہ، عشق کا والہانہ پن ہے۔ لفظ، آواز، رنگ اور سنگ یہ سب واسطے ہیں۔ زندگی کا حقیقی حُسن و جمال دیکھنا چاہتے ہو، تو اِن واسطوں، اِن پردوں کو درمیان سے اُٹھا دو۔" میں نے جس قدر شعر کہے تھے سب پھاڑ ڈالے، جتنی تصویریں بنائی تھیں انھیں نذرِ آتش کر دیا، موسیقی کا جس قدر ساز و سامان لے کر آیا تھا اُسے توڑ پھوڑ کر باہر پھینک مارا۔ اب مجھے ایک خاص انداز کی لطافت فضا میں اُڑائے لیے جا رہی تھی۔

میں بہت محظوظ ہو رہا تھا، میرے احباب پھر سمجھانے کے لیے آگئے: "دوست! تم نرے چغد ہو۔ کیسے اچھے شعر کہتے تھے، کیا عمدہ راگ الاپتے تھے، کیسے غضب کی تصویریں بناتے تھے، ظالم! یہ تم نے کیا کیا، آخر اپنی صلاحیتوں کو خاک میں ملانے پر کیوں تل گئے؟" میں نے غصّے میں جواب دیا: "ذرا سوچو تو سہی، لفظ، رنگ، آواز یہ میرا مقصدِ حیات ہیں ؟ تم لوگوں کی خواہش ہے کہ میں لفظوں، رنگوں اور آوازوں کے زندان میں قید ہو کر رہ جاؤں ؟ تم مجھے نرا شعبدہ باز بنانا چاہتے ہو ؟ تمھاری آرزو ہے کہ میں حقائق کے ہیچھے حسن و جمال سے محروم ہو جاؤں۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" یہ سن کر میرے ناصح دوست میرے پاس سے اُٹھ کر چلے گئے۔ اُن کا خیال تھا میں پاگل ہو گیا ہوں۔ مجھے فنونِ لطیفہ کی اہمیت سے انکار نہیں، بلکہ میرا تو ایمان ہے کہ فن معرضِ وجود میں آیا ہی اس لیے ہے کہ وہ انسان کو سیدھی طرح ناک پکڑنے کے حیات افروز احساس سے پوری طرح آگاہی بخش سکے۔ ایک سچا فن کار نہ صرف خود سیدھی طرح ناک پکڑتا ہے، بلکہ دوسروں کو بھی اس کارِ جمال پرور میں شریک کرتا ہے۔ البتہ ذرا سی غفلت کی بنا پر جب فن کار کا ہاتھ اپنی ناک کے بجائے دوسروں کی ناک پر پڑتا ہے، تو اس کا سب کیا کرایا دھرا رہ جاتا ہے۔ اِسی لیے یہ کہنا درست ہے کہ مقصدیّت نے فن کی معصومیّت کو ہمیشہ نقصان پہنچایا۔

آدمی زندگی میں خواہ مخواہ دشواریاں کیوں پیدا کرتا ہے ؟ شاید اس لیے کہ اُس میں زندگی کی آسانیوں سے بہرہ ور ہونے کی تاب نہیں۔ انسانی زندگی ایک شفّاف ندی کے مانند ہے۔ پھر ہم اسے گدلا کیوں کرتے ہیں ؟ یقیناً ہمیں اس میں اپنی صورت نظر آجاتی ہے جسے دیکھ کر ہم بے اختیار ڈر جاتے ہیں۔ اپنی شبیہ کا خوف نہ صرف ہمیں اس ندی میں اوندھے مُنھ گرا دیتا ہے، بلکہ اپنے ساتھ ہم دوسروں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ سادہ زندگی ایک آئینہ

ہے جس میں آدمی اپنے آپ کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہے، لیکن پہلی جھلک خواہ کسی نوعیت کی ہو اُسے متوحش ضرور کرتی ہے۔ اکثر لوگ اپنی پہلی جھلک نہیں دیکھ پاتے اور پھر محرومی کا یہ سلسلہ بہت دُور تک چل نکلتا ہے۔

قِصّہ دراصل یہ ہے کہ انسان بننے کی کوشش میں آدمی اپنی ناک سیدھی طرح نہیں پکڑتا۔ اُس کا خیال ہے سیدھی طرح ناک پکڑی، تو وہ نرا آدمی رہ جائے گا اور اُسے انسان بننے کی سعادت نصیب نہیں ہو سکے گی، حالانکہ انسان بننے کی پہلی کڑی شرط یہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو آدمی سمجھے، ہاتھ گھما کر ناک پکڑنے میں یہ قباحت ہے کہ اِس عمل میں آدمی اپنے آپ کو آدمی سمجھنا بھُول جاتا ہے۔ بغور دیکھا جائے تو یہ پوری انسانیّت کی تگ و دَو کا المیہ ہے۔ آدمی انسان بننے کی کوشش میں اپنی آدمیّت کو پے درپے فراموش کرتا رہتا ہے جس کے نتیجے میں انسان بننا تو درکنار اُس کی آدمیّت بھی اپنی صحیح شکل میں برقرار نہیں رہتی۔ سچ پوچھیے تو ابھی تک آدمی نے آدمیّت اور انسانیّت کو فروغ دینے کے بجائے اپنے جانورپن کو زیادہ بنایا اور سنوارا ہے — اِس کا سبب اِس کے سوائے اور کچھ نہیں کہ اُسے تاحال سیدھی طرح ناک پکڑنی نہیں آئی۔ زندگی کی بے شمار سہولتیں ازل سے لے کر آج تک اُس کا مُنھ تک رہی ہیں۔

نوٹ:۔ مجھے اعتراف ہے کہ اِس مضمون میں کوشش کے باوجود میں ایک بار بھی اپنی ناک سیدھی طرح نہیں پکڑ سکا۔ میرے دوست صفدر محمود کا کہنا ہے کہ "مشکور بھائی! سیدھی یا اُلٹی طرح ناک پکڑنے کا سوال تو وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں ناک ہو۔" معلوم نہیں صفدر کا اشارہ میری اجتماعی زندگی کی طرف ہے یا انفرادی۔ ویسے نظریں نیچی کر کے دیکھتا ہوں، تو اپنی ناک پچکی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

لمحے کا دوام

کائنات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آپ کے ذہن میں خواہ وقت کا کوئی تصور ہو مجھے اِس سے غرض نہیں۔ میں تو انسانی زندگی کے حوالے سے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انسان کے لیے وقت کے وہ معنی نہیں ہیں جو کائنات کے لیے ہیں۔ کائنات گزر رہی ہے یا وقت گزر رہا ہے اِس کا فیصلہ آپ خود کیجیے۔ ہو سکتا ہے کائنات کے گزرنے کا دوسرا نام وقت ہو اور وقت بالذّات کوئی حقیقت نہ رکھتا ہو۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وقت کے بطن ہی سے کائنات پیدا ہوئی ہو۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی زندگی میں وقت کی کوئی بھی حیثیت ہو، انسانی زندگی میں اُس کی وہ حیثیت نہیں۔ انسانی زندگی میں تو لمحہ حیثیّت رکھتا ہے۔ آپ فرمائیں گے لمحہ بھی تو وقت ہے۔ میں جواباً عرض کروں گا کہ اگر یہ بات ہے تو پھر کائنات پر آج تک صرف ایک لمحہ گزرا ہے۔ اس کے برعکس انسان کی زندگی بے شمار لمحوں کا مجموعہ ہے۔ گویا کائنات صرف ایک لمحے سے بہرہ ور ہو کر رقص کناں ہے اور انسان پر آئے دن لمحوں کا نزول رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے انسان پر ان گنت وقت وارد ہوتے ہیں۔ یہ وقت یہ لمحے کہاں سے آتے ہیں مجھے اِس کا کچھ علم نہیں۔ البتّہ اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اِن لمحوں کا اپنا ایک وجود ہے جو کائنات اور انسان کے وجود سے علیحدہ حیثیّت رکھتا ہے۔ کائنات غریب

تو خیر ایک لمحے کے جرم میں پکڑی ہوئی ہے وہ اِن لمحوں پر کیا اثر انداز ہو سکتی ہے۔ البتہ انسان کی خواہش وہ تنہا قوت ہے جو اِن لمحوں کی تخلیق میں براہِ راست اپنا اثر دکھاتی ہے ۔۔۔۔ انسان کی خواہشات اور آرزوؤں کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے ۔ یہ دُرست ہے کہ انسانی خواہش کائنات میں اپنے منشا کے مطابق تبدیلیاں بھی لا سکتی ہے اور لاتی رہتی ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو یہاں اس عمل کی زیادہ اہمیت نہیں۔ انسانی خواہش کی عظمت، تو اِسی میں ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق لمحوں کے درود کا باعث بن جاتی ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی خواہش تخلیقِ لمحات پر بڑی حد تک قدرت رکھتی ہے، لیکن لمحے کو تخلیق کرنے کے بعد اُسے دیر تک زندہ رکھنا اُس کے بس کی بات نہیں ۔ مثال کے طور پر میری یہ شدید خواہش ہے کہ میں حتی الامکان دُنیا کے علائق سے بے نیاز ہو جاؤں، چنانچہ میری اس خواہش کے تحت ایسا تو ہو سکتا ہے کہ میں لمحہ بھر کے لیے یہ محسوس کر لُوں کہ واقعی میں دُنیا کی تمام ضرورتوں سے بے نیاز ہو گیا ہوں، لیکن اِس لمحے کو دوام بخشنا مجھے اپنی دست رس سے باہر نظر آتا ہے۔ اس بے بسی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میرے دل میں بے نیاز ہونے کی خواہش باقی نہیں رہی۔ خواہش اپنی جگہ موجود ہے، یوں بھی کوئی خواہش ایک دفعہ پیدا ہو جائے تو مرتی نہیں، زیادہ سے زیادہ اپنا بھیس بدل لیتی ہے۔ البتہ لمحے پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں سارا مسئلہ مثالی لمحے کو زندہ رکھنا اور اُسے دوام بخشنا ہے۔ لمحہ خیال کی صورت میں پیدا ہوتا ہے اور خون بن کر رگ و پے میں دوڑنے لگتا ہے۔ ہزار مثالی ہونے کے باوجود لمحہ اِس حد تک حقیقت بھی بن جاتا ہے کہ ہم اُسے مکمل طور پر محسوس کر لیتے ہیں۔ اس حالت میں ہمیں لمحے کا ادراک ذہن کے ذریعے نہیں بلکہ حواس کے ذریعے ہوتا ہے۔ ہم ایک بار تو خوشی سے اچھل پڑتے ہیں۔ اُف گوشت پوست کے انسان ہوتے ہوئے بھی ہم اپنے آئیڈیل

سے کس قدر قریب ہیں۔ اتنے قریب جیسے ہم خود اپنا آئیڈیل، اپنی مثال بن گئے ہیں۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ بظاہر ہمارے احوال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہم پر یہ مثالی کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی، کوئی دوسرا ذلیل سا لمحہ آتا ہے اور ہمارے اِس عظیم لمحے کو خاک میں مِلا کر خود ہم پر مسلّط ہو جاتا ہے۔ ذلیل، کمینے اور تنگ دامن لمحے عموماً ہمیں اپنی گرفت میں لیے رکھتے ہیں ___ سرخرو اور سرفراز ہونے کی خواہش اِن لمحوں سے نجات دلاتی ہے، لیکن بہت تھوڑی سی مدت کے لیے ___ میں سوچتا ہوں آخر ہم اپنے عظیم لمحوں کو زندہ کیوں نہیں رکھ سکتے، انھیں دوام کیوں نہیں بخشتے، انھیں اپنی پوری زندگی پر کیوں نہیں پھیلا دیتے۔

انسان کو اُس کا آئیڈیل (IDEAL) کبھی محروم نہیں رکھتا۔ بامراد زندگی آئیڈیل کا اوّلین انعام ہے۔ البتہ آئیڈیل انسان کو مغموم اور مظلوم ضرور بنا دیتا ہے۔ دراصل آئیڈیل سراب نہیں ایک حقیقت ہے، ایسی حقیقت جس کا حصول اپنی اپنی ہمت پر ہے۔ انسانی زندگی میں لمحے کی اہمیت اِس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ بعض وقت وہ (یعنی لمحہ) اپنے دامن میں آئیڈیل کا معتدبہ حصّہ لیے ہوئے وارد ہو جاتا ہے جس کے طفیل انسان کی ہمت کو بھی چار چاند لگ جاتے ہیں ___ گویا فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّت اوست کا دیرینہ اصول قائم نہیں رہتا۔ ہمت کا پیمانہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بلند سے بلند تر۔ وسیع سے وسیع تر ___ یوں لگتا ہے جیسے عالی ظرفی کسی کی میراث نہیں، یہ بھی انسانی تجربے کا فیضِ عام ہے۔

میں انسانی حُسن کے معاملے میں خاصا بودا واقع ہوا ہوں۔ جسم کی ذرا سی خُوبی بھی میرے لیے بلا کی کشش رکھتی ہے۔ میں اِس طرح متاثر ہونے کو اپنا ہرجائی پن تصوّر کرتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں آخر میری نظر میں اتنی وسعت اور توانائی کیوں نہیں کہ ایک انسانی پیکر

ہی میں تمام حُسن وجمالِ انسانی کا نظارہ کرسکوں۔ایک دن کا ذکر سُنیے میں کچھ اِسی قسم کی اُدھیڑبُن میں مصروف تھا کہ ایک بھرپُور لمحہ وہ تمام قدرت اور وسعت لے کر وارد ہوا جس کی مجھے مدّت سے تمنّا تھی۔میں نے اپنی شریکِ حیات کے پیکر میں حُسنِ انسانی کو جی بھر کر دیکھا۔لُطف کی بات یہ ہے کہ اِس لمحے کی عمر عام مثالی لمحوں کی طرح مختصر نہ تھی۔ یہ لمحہ منٹوں گھنٹوں کا تو ذکر ہی کیا ہے دنوں تک پھیل گیا۔واضح رہے کہ یہ میری ازدواجی زندگی کا آغاز نہیں تھا کہ اِسے میرے جذبات کی تندی وتیزی سے تعبیر کیا جاسکے۔اُس وقت میری شادی کو غالباً بارہ سال گزر چکے تھے۔لہٰذا اِس مثالی لمحے کو سراب تو کسی طرح نہیں کہا جاسکتا، یہ میری خواہش کی کرشمہ سازی ضرور ہوسکتی ہے۔

بعض وقت ہم زندگی کے بُلند سے بُلند مقام کو چُھو جاتے ہیں۔عموماً یہ عرصہ بہت قلیل ہوتا ہے اس قدر قلیل کہ اکثر اوقات ہمیں اُس کا احساس تک نہیں ہوتا مثالی لمحہ اپنے ہمراہ عزائم کی بے پناہ قوت لے کر آتا ہے۔تمنّا اور خواہش کی استقامت اِس قوت کو قابو میں رکھ سکتی ہے۔ لیکن استحکامِ تمنّا کے معنی محض اپنے خیال میں لانا ہی نہیں ہے، یہ تو تمنّا کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالینے والی بات ہے۔ہم طرح طرح کی تمنّائیں تو کرلیتے ہیں لیکن اِن تمنّاؤں کو مقصد کا درجہ نہیں دیتے۔یہی وجہ ہے کہ ہم استقلال واستحکام سے بے بہرہ بنتے ہیں۔مگر کس کس تمنّا کو مقصد کا درجہ دیا جائے۔بقول غالبؔ یہاں تو ہر خواہش ایسی ہے جس پہ دم نکلنے کو تیار رہتا ہے۔بغور دیکھا جائے تو استقلالِ تمنّا اصل مسئلہ نہیں۔ اصل مسئلہ تمنّا کے انتخاب کا ہے۔کس خواہش کو اپنی زندگی کی روح رواں بنایا جائے؟ خواہشات کے ہجوم میں ہم انتخاب کی صلاحیت سے محروم ہوجاتے ہیں۔یہی محرومی جو فی الحقیقت ہماری بوالہوسی ہوتی ہے، مثالی لمحے کو ہم سے چھین کر دُور لے جاتی ہے۔

میں اُن لمحوں کی حقیقت سے انکار نہیں کرتا جو موسمی پھلوں کی طرح ہماری زندگی میں آتے رہتے ہیں اور اپنی خاص خوشبو، رنگ روپ اور ذائقے سے ہمیں محظوظ و مسرور کر کے چلے جاتے ہیں۔ میرا موضوعِ بحث تو اُس لمحے کو دوام بخشنا ہے جو مجھے کسی بلند آرزو کے نقطۂ عروج پر پہنچا دیتا ہے اور میں ابھی وہاں پاؤں رکھنے بھی نہیں پاتا کہ دھڑام سے نیچے آگرتا ہوں۔
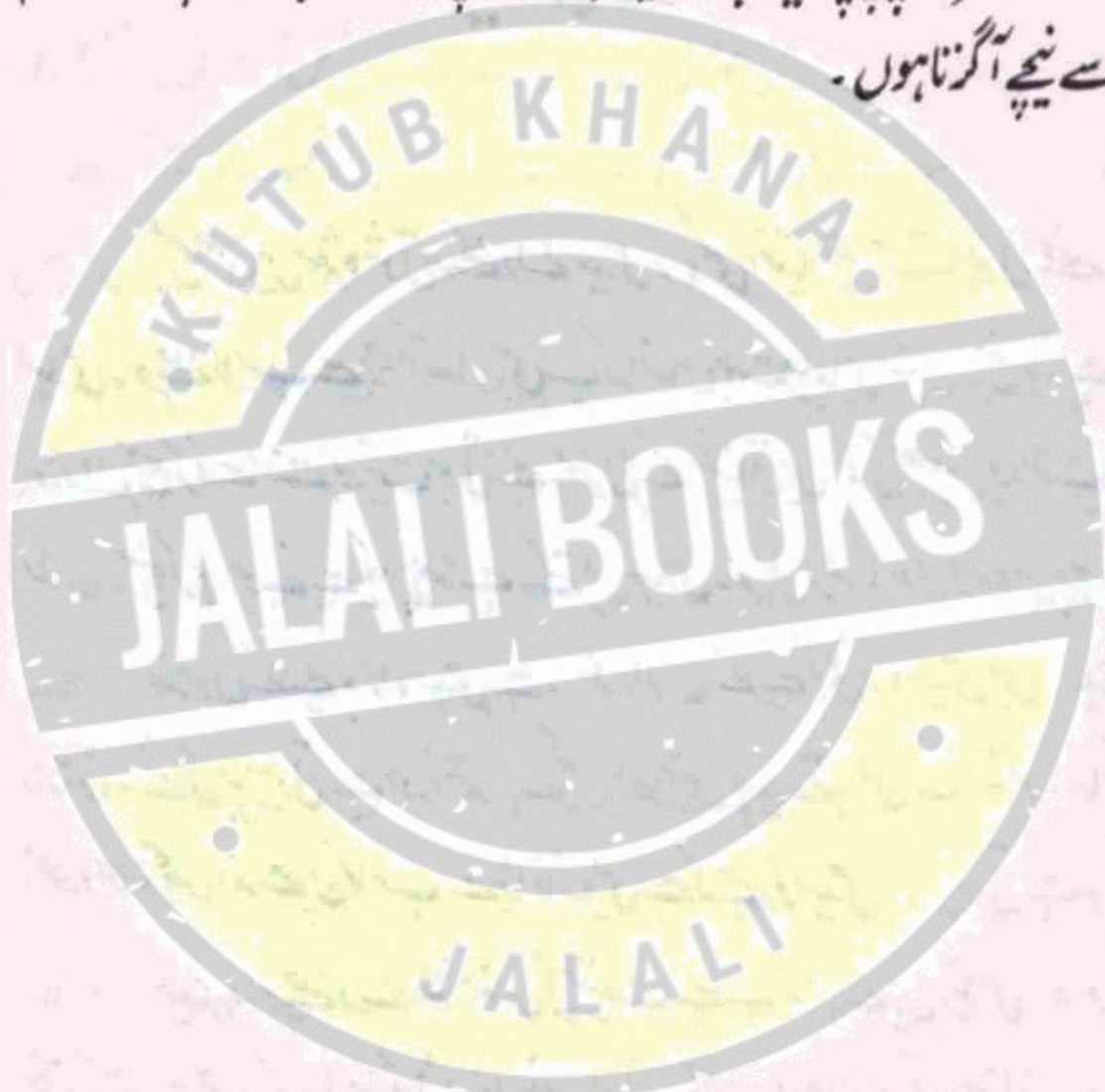
سیدھی راہ

صحیح معنی میں سفر کا شوق رکھنے والے سیدھی راہ کبھی اختیار نہیں کرتے۔ بقول شخصے سیدھی راہ چلنے کا سب سے بڑا نقصان یہی ہے کہ انسان بہت جلد اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے اور وہاں پہنچ کر اسے سخت بوریت ہوتی ہے۔ منزل کے اشتیاق میں سفر کی تکلیفیں برداشت کرنا منزل پر پہنچ کر بور ہونے سے کہیں بہتر ہے۔ کہتے ہیں سیدھی راہ چل کر عموماً آدمی کولھو کا بیل بن جاتا ہے۔ اندھوں کے لیے ہر راہ سیدھی ہے۔ آنکھ والوں کے لیے کوئی راہ سیدھی نہیں، سیدھی راہ عموماً مانگے کی چیز ہوتی ہے اور آنکھ والے کبھی ہاتھ نہیں پھیلاتے (جس نے ہاتھ پھیلا دیا اُسے آنکھ والا نہ سمجھو) اندھے پن کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ چلنے کو سیدھی راہ مل جاتی ہے۔

سیدھی راہ چلنے والے اکثر منزل کی حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں، ٹیڑھی راہ وہ اختیار کرتا ہے جس کے سامنے کوئی منزل نہیں ہوتی (ٹیڑھی راہ چلنا اور گمراہ ہونا ایک ہی چیز نہیں ہے) مانگے کی سیدھی راہ پر چلنے کے لیے اصول بنانے کی ضرورت پیش نہیں آتی، آہستہ چلو یا تیز، تھکن دونوں صورتوں میں ہوتی ہے۔ بہت سے راہی اسی تھکن کو منزل سمجھ کر پاؤں پسار دیتے ہیں۔

سیدھی راہ اکثر بنی بنائی مل جاتی ہے، تلاش نہیں کی جاتی۔ ٹیڑھی راہ تلاش کا نتیجہ

ہوتی ہے، بنی بنائی نہیں ملتی۔ ذوقِ جستجو نہ ہو، تو انسان کبھی ٹیڑھی راہ نہ چلے۔ جب تک منزل سامنے نہیں ہوتی آدمی ٹیڑھی راہ چلتا ہے۔ منزل نظر آ جائے، تو ٹیڑھی راہیں بھی سیدھی ہو جاتی ہیں۔

ہر منزل کے لیے ایک سیدھی راہ ہوتی ہے۔ اس لیے سیدھی راہ دوزخ میں بھی لے جا سکتی ہے اور جنت میں بھی۔ منزل اگر دوزخ ہے اور مسافر اُس کی بھڑکتی ہوئی آگ کو دُور سے ہجومِ شعلہ رخاں سمجھ رہا ہے، تو ایسی صورت میں ٹیڑھی راہ نعمتِ غیر مترقبہ سے کم ثابت نہیں ہوتی، مسافر کو منزل تک لے آنے کے بجائے وہ اُسے منزل کے تصوّر ہی میں مگن رکھتی ہے اور یُوں اُس کی جان بچنے کا سامان ہو جاتا ہے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ جب سامنے بدی کی منزل ہوتی ہے، تو انسان ٹیڑھی راہ ہرگز اختیار نہیں کرتا۔ اُس کا پہلا قدم ہی سیدھی راہ پر پڑتا ہے۔ ٹیڑھی راہیں تو نیکی کی منزلوں کے مقدر میں لکھی گئی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے، تو ٹیڑھی راہ چلنا بہت آسان ہے اور سیدھی راہ چلنا سخت کٹھن۔ ٹیڑھی راہ چلتے ہوئے انسان اپنی جان پر کسی قسم کا بار محسوس نہیں کرتا۔ سیدھی راہ پر قدم رکھتے ہی بے پناہ ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑتا ہے۔

سیدھی راہ چلنے والے کو کبھی نیند نہیں آتی۔ نیند آ جائے، تو نہ منزل رہتی ہے اور نہ راہ۔ دونوں سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ ویسے راہ سے بھٹک جانا ایسی کوئی خطرے کی بات نہیں، بعض اوقات یہ ایک نیک فال ثابت ہوتی ہے۔ منزل کو دل سے فراموش نہ کر دیا گیا ہو، تو بھٹکنے والے کو یہ خود بخود پکار لیا کرتی ہے۔ گمراہی سے زیادہ درماندگی سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔ انسان کو گمراہ، تو منزل پر پہنچنے کا حد سے بڑھا ہوا شوق بھی کر سکتا ہے، لیکن درماندگی کا سبب کمئ شوق یا فقدانِ شوق کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ مسافروں کو راہوں کے

خطرے بہت کم ہلاک کیا کرتے ہیں، ان کی موت کی اصل وجہ یہی شوق کی کمی یا اس کا فقدان ہوتا ہے۔

راہ ٹیڑھی ہو یا سیدھی اگر اس پر بار بار چلنا پڑے، تو انسان اُکتا جاتا ہے، چنانچہ اصل سیدھی راہ وہ ہے جس پر چل کر جی نہ اکتائے۔ کہتے ہیں سیدھی راہ پر کوئی قدم دوبارہ نہیں اُٹھتا۔ ہر قدم ایک نئے فاصلے اور نئی منزل کو طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ سیدھی راہ جدتوں اور ندرتوں سے مالا مال رہتی ہے۔

ویسے تو سیدھی راہ تیر کی طرح جاتی ہے، لیکن چلنے والے کو یوں محسوس ہوتا رہتا ہے جیسے گام گام پر پیچ و خم آ رہے ہیں؛ وہ راہ سیدھی کیا ہو سکتی ہے جس پر چلتے ہوئے ہر وقت مُنھ کے بل گرنے کا احساس دامن گیر نہ رہے؟ ٹھوکریں کھائے بغیر آدمی کو عقل، تو آ سکتی ہے، لیکن عقل سے کام لینا ٹھوکریں کھا کر ہی آتا ہے۔ ہوش و حواس ٹھکانے نہ ہوں، تو سیدھی راہ پر ایک قدم بھی نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ سیدھی راہ کو بال سے باریک اور تلوار سے تیز اسی لیے کہا گیا ہے کہ اس پر چلنے کے لیے بڑے متوازن دل و دماغ کی ضرورت ہے۔

سفر کی ساری گہما گہمی اور چہل پہل منزل کے دم قدم سے ہے، لیکن منزل ہمیشہ مُسافر سے دُور بھاگتی ہے۔ انسانی زندگی ہزار جدتوں کے باوجود لامحدود ہے۔ نیکی کی کوئی منزل نہیں ہے، کیونکہ نیکی کی کوئی حد نہیں ہے، بدی چونکہ محدود ہے، اس لیے اس کی منزلیں بھی بہت۔ جس قدم پر چاہو منزل بنا کر بیٹھ جاؤ۔ بدی کی راہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے، نیکی کی راہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اس پر چلنا چاہے، تو آدمی مسلسل چل سکتا ہے۔ یہاں تھکن مسافر کو بٹھاتی نہیں، اس کی رفتار میں تیزی پیدا کرتی ہے۔ اس راہ میں کوئی جس قدر تھکتا ہے، اسی قدر سُرعت کے ساتھ اس کے قدم منزل کی طرف بڑھتے ہیں۔

کون ہے جو سیدھی راہ اختیار کرنا نہیں چاہتا؟ لیکن اس پر قدم رکھتے ہی شدت کے ساتھ تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی تنہائی کا احساس جس کی لپیٹ میں پوری کائنات ہوتی ہے۔ آج تک کسی نے دو مسافروں کو سیدھی راہ پر قدم ملا کر چلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہاں انسان کو اوّل سے لے کر آخر تک (اگر کوئی آخر ہے) تنہا سفر کرنا پڑتا ہے۔

تنہائی کی وجہ یہ ہے کہ سیدھی راہ کا آغاز ہر انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ سیدھی راہ انسان کی ذات سے شروع ہوتی ہے اور پھر تمام کائنات کا سینہ چیرتی ہوئی اسی کی ذات میں آملتی ہے (یہ واضح رہے کہ سیدھی راہ دائرہ نہیں بناتی)

سیدھی راہ کوئی راہ نہیں ہے، یہ تو ایک منزل ہے، ایسی منزل جو ہر لمحہ آگے بڑھتی رہتی ہے اور مسافر اس کے تعاقب میں لگاتار چلتا رہتا ہے۔

جس نے سیدھی راہ پر قدم رکھ دیا، سمجھ لیجیے اُس نے منزل کو پالیا۔ سفر کی فکر، راہوں کے خطرے، ٹھکانے پر پہنچنے کا خیال، پیچ وخم کی الجھنیں یہ تمام چیزیں اسی وقت تک ہوتی ہیں جب تک آدمی سیدھی راہ اختیار نہیں کرتا، اس راہ میں اُٹھا ہوا ہر قدم یقین کی بے حساب دولت ساتھ لاتا ہے۔ ویسے یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ سیدھی اور ٹیڑھی راہوں کے مخمصے میں عموماً وہ لوگ زیادہ پڑتے جنھیں چلنا نہیں آتا۔

ناجائز تعلّقات

زمان و مکان کی کوئی قید نہیں، مشرق ہو یا مغرب، میاں بیوی کے تعلقات ہر جگہ اور ہمیشہ خراب رہتے ہیں، ان کی خرابی دائمی ہے اور بقائمی ہوش و حواس ہے۔ یہ ایک ایسی گاڑی ہے جسے کبھی صحیح طور پر چلتے ہوئے نہیں دیکھا گیا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر یہ ٹھیک طور پر چل پڑے، تو دُنیا کی ساری چہل پہل خاک میں مل جائے۔ ان تعلقات کو ٹھیک کرنے کی لگاتار کوشش کے نتیجے میں لگاتار بچے عدم سے وجود میں آتے رہتے ہیں اور چونکہ یہ تعلقات پھر بھی ٹھیک نہیں ہوتے، اس لیے تخلیق کا عمل برابر جاری رہتا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ تعلقات اچھے ہو جائیں، تو دُنیا میں میاں بیوی کے سوا کوئی باقی نہ رہے۔ من تو شدم تو من شدی کے تحت بیوی، میاں بن جائے اور میاں بیوی نظر آنے لگے۔ گویا یہ بھی اس ویران دنیا میں دو نہ رہیں، ایک ہو جائیں۔ غرض میاں بیوی کے تعلقات بیل کے اس سینگ کے مانند ہیں، جس پر تمام دنیا ٹھہری ہوئی ہے۔ ابھی تک یہ تحقیق نہیں ہو سکی کہ میاں بیوی کے تعلقات اور محبوب کی کمر ان دونوں میں سے کون سی چیز زیادہ نازک ہے۔ کہتے ہیں جہاں تک لچکنے کا تعلق ہے، محبوب کی کمر اتنی نہیں لچکتی جتنا کہ میاں بیوی کے تعلقات لچکتے اور بل کھاتے ہیں۔ میاں بیوی کے تعلقات کو بلا خوفِ تردید اونٹ کے ساتھ تشبیہ دی جا سکتی ہے

اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی — ان تعلقات میں بھی آپ کو کوئی کل سیدھی نظر نہ آئے گی۔ یہاں ہر بات کا سر پیر کچھ اپنے ہی ڈھب کا ہوتا ہے۔ شُترِ بے مہار کی ترکیب جتنی ان تعلقات پر صادق آتی ہے، شاید ہی کہیں صادق آتی ہو۔ آپ پہلے سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ زندگی کے صحرائے بے اماں میں میاں بیوی کے تعلقات کا اونٹ کس طرف کو دُم اُٹھا کر بھاگ نکلتا ہے۔ اسی طرح میاں بیوی کے تعلقات اس قدر غیر یقینی ہوتے ہیں کہ دوسرے تو پھر دوسرے ہیں خود میاں بیوی ہر لحہ یہ محاورہ استعمال کرنے پر مجبور ہیں کہ دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ سچ پوچھیے، تو اس بے یقینی کی کیفیت میں ان تعلقات کی بقا کا راز بھی پوشیدہ ہے۔ زوجین کے تعلقات میں یقین کی صورت پیدا ہو جائے، تو نظامِ عالم چہ پدّی چہ پدّی کا شوربا نظامِ عدم کے درہم برہم ہونے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ آپ نے اُونٹ کے مُنھ میں زیرہ والی ضرب المثل تو سُنی ہو گی۔ بس یُوں سمجھیے محبّت زیرا ہے اور میاں بیوی اونٹ، مطلب یہ ہے کہ بیوی بے چاری میاں کے لیے مرنے کو مر جاتی ہے۔ لیکن وہ یہی سمجھتا ہے کہ بیوی کو اس کا کوئی خیال نہیں۔ اسی طرح میاں غریب، بیوی کی خاطر داری میں دن رات ایک کر ڈالتا ہے۔ لیکن بیوی ہمیشہ یہی کہتی رہتی ہے۔ اُنھیں مجھ سے ذرا محبّت نہیں۔

زوجین میں سے کسی کی ہوسِ دلجوئی کبھی پُوری نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اونٹ کا مُنھ بنے رہتے ہیں — ہم نے کبھی ان معنی میں میاں کو بیوی سے اور بیوی کو میاں سے سیر ہوتے نہیں دیکھا۔

پُل صراط کے تصوّر سے کون مسلمان واقف نہیں۔ اسے تلوار کی دھار سے تیز اور بال سے باریک بتایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں اس پر سے گزرنے میں وہی بکرے یا دُنبے کام آئیں گے جو بڑی عید پر حلال کیے جاتے ہیں۔ عام طور پر میاں بیوی کے تعلقات کو انھی بکروں

یا دُنبوں کی طرح خیال کیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ دوسری دُنیا ہی نہیں۔ اس دنیا کی کٹھن منزلوں سے گزرنے کے لیے بھی یہ تعلّقات ازبس ضروری ہیں۔ لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلتا ہے۔ میاں بیوی کے تعلّقات مددگار ثابت ہونے کے بجائے خود پُل صراط بن جاتے ہیں۔ ایسی پُل صراط جو واقعی تلوار کی دھار سے تیز اور بال سے باریک ہوتی ہے۔ اس پر سے گزرتے وقت ایک نہیں میاں اور بیوی دونوں کو ہاتھ پاؤں سے زخمی اور دُنبہ بنے دیکھا گیا ہے۔

دراصل انسان فطرتاً خود غرض ہے، لیکن ازدواجی تعلّقات اس خود غرضی کو کم کرنے کے بجائے عام حالات میں تیز تر کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے زندگی کا عام راستہ بھی پُل صراط بن جاتا ہے، گویا میاں بیوی کو اس زندگی ہی میں پُل صراط سے گزرنا پڑ جاتا ہے اور صرف اپنا بوجھ اُٹھا کر ہی نہیں، بلکہ ایک دُنبہ یا دُنبی بھی کمر پر سوار ہوتی یا ہوتا ہے۔

میاں بیوی کے تعلّقات ایک ایسی دونالی بندوق ہے، جس کا نشانہ عموماً خود میاں بیوی بنتے ہیں، لیکن اپنے سینوں پر پے در پے گولیاں کھانے کے باوجود ان میں سے مرتا کوئی نہیں ـــــ بعض صورتوں میں، تو ایسا دیکھا گیا ہے کہ جس قدر زیادہ وار پڑتے ہیں۔ اتنی ہی سینوں میں فولادی خصوصیات پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔

زن و شوہر کے تعلّقات کو کولہو کے بیل سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے، لیکن ہزار تجسّس کے باوجود یہ معلوم نہیں ہو پایا کہ کولہو کا بیل میاں کے گرد گھومتا ہے یا بیوی کے ـــــ اور تیل نکلتا ہے، تو کس کا؟ اور پھر اس بیل کی آنکھوں پر پٹّی باندھنے والا کون؟ معاشرہ یا خود میاں بیوی؟ کسی کا کہنا ہے کہ اس بیل کا ہانکنے والا کوئی نہیں۔ محبّت کی گھنٹیوں کے بجائے حماقت کے گھڑیال کی آواز اِسے رات دن سرگرمِ سفر رکھتی ہے۔

ازدواجی تعلّقات ایک ایسی کتاب کے مشابہ ہیں جس کے ہر صفحہ پر ہر لمحہ کچھ نہ

کچھ لکھا جاتا ہے اور فوراً کاٹ بھی دیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ کتاب جتنی لکھی جا چکی ہے اس کا کوئی مطلب اخذ نہیں کیا جا سکتا اور جس قدر لکھنا باقی ہے، اس کے بارے میں اچھی امیدیں رکھنا ہی سب سے بڑی حکمت عملی شمار کی جا سکتی ہے۔

میاں بیوی کے تعلقات کی بجلی چمکتی تھوڑی دیر کے لیے اور کڑکتی زیادہ دیر کے لیے ہے۔ اس لیے ان تعلقات کے جمالی پہلوؤں سے آشنا ہونے کی سعادت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے اور جلالی پہلوؤں سے ہر کوئی دوچار ہوتا ہے۔ یہ تعلقات ایسی جھڑی کے مانند ہیں جو ایک بار لگ جائے تو پھر عمر بھر پیچھا نہیں چھوڑتی۔ آج تک کسی نے ان تعلقات کا مطلع صاف نہیں دیکھا۔ کسی سورج اور کسی ہوا میں اس کے بادلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی ہمت نہیں۔ یہ گرجتے بھی ہیں اور برستے بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تمام جل تھل کے باوجود میاں بیوی کا حلق بُری طرح خشک رہتا ہے۔

میاں بیوی راضی، تو کیا کرے گا قاضی۔ اس کہاوت کا مفہوم قاضی کے سوا میں اور آپ سب جانتے ہیں۔ قاضی اس کا مطلب کیوں نہیں سمجھتا اور میاں بیوی کے درمیان قاضی کب اور کیسے آدھمکا۔ ان سوالات کا جواب دینا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ مجھے کہنے کی اجازت دیجیے، آپ ہر طرح کے انسانی تعلقات کو جائز قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن میاں بیوی کے تعلقات کو جائز قرار دینا قریب قریب ناممکن ہے۔ میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ ناجائز تعلقات کا تصور ہی میاں بیوی کے تعلقات کا لازمی نتیجہ ہے۔ ان تعلقات سے پہلے کوئی انسانی تعلق ناجائز نہیں تھا ــــــ ایک دفعہ کا ذکر ہے، ایک بادشاہ سلامت کے دماغ میں یہ کیڑا اُسر لانے لگا کہ میاں بیوی کے تعلقات کی تفتیش کی جائے؛ چنانچہ تمام سلطنت میں اشتہار جاری ہو گیا کہ جو میاں بیوی اپنے تعلقات کو جائز کہتے ہیں وہ حضورِ عالی میں حاضر ہو کر

اس کا ثبوت پیش کریں۔ ایسا کرنے والے کو مُنھ مانگا انعام دیا جائے گا۔

اس اشتہار کو جاری ہوئے ایک عرصہ گزر گیا، لیکن بادشاہ کے حضور کوئی جوڑا حاضر نہ ہو سکا۔ بادشاہ کو تشویش ہوئی کہ کہیں اس کی رعایا میں حرامی پن، تو رواج نہیں پا گیا۔ ایک وزیر باتدبیر ہاتھ باندھ کر بولا:

"جان کی امان پاؤں، تو کچھ عرض کروں"۔

"تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو بے خوف و خطر بیان کرو"۔

وزیر نے ڈرتے ڈرتے کہا: "رعایا کے احوال معلوم کرنے سے قبل حضور کو......"

"بس بس تمہیں اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، ہم سب کچھ سمجھ گئے ہیں"۔ یہ کہہ کر بادشاہ اپنے حرم میں گیا اور تمام لونڈیوں، کنیزوں اور بیگموں سے کہنے لگا، جو کوئی اپنے تعلقات کو ہم سے جائز نہیں سمجھتی وہ کسی خوف و ہراس کے بغیر ہمارے پاس سے جا سکتی ہے۔ اس پر نہ صرف کوئی عتاب سلطانی نازل نہیں ہوگا، بلکہ اُسے زندگی گزارنے کے لیے خاطر خواہ خرچ بھی دیا جائے گا۔

بادشاہ نے دیکھا کہ سب سے پہلے وہ لونڈیاں، کنیزیں اور بیگمات اُٹھ کر چلی ہیں جن پر اسے بے حد اعتماد تھا۔ اس جانکاہ واردات کے بعد بادشاہ نے اپنا سر منڈوایا، منھ پر سیاہی ملی اور سلطنت اس وزیر کے سپرد کر کے ایک مادہ خر پر سوار ہو کر شہر پناہ سے باہر نکل گیا۔ وہ کہتا جاتا تھا۔

"انسانی تعلقات کی بنیاد آزادی اور ایجاب و قبول پر ہے۔ اگر ایسا نہیں، تو انسان جانوروں سے بھی گئی گزری مخلوق ہے۔۔۔ جانوروں سے بھی گئی گزری مخلوق"۔

انسانی معاشرہ اور کردار

جہاں تک انسانی معاشرے میں کردار کی اہمیّت کا سوال ہے، ہم لاشعوری طور پر اس حد تک حساس واقع ہوئے ہیں کہ معمولی سے غور و فکر کے بعد ہی پکار اُٹھتے ہیں کہ کردار کے بغیر انسانی معاشرے کا وجود ممکن نہیں۔ حالانکہ بنظرِ غائر دیکھا جائے، تو پتہ چلتا ہے کہ انسانی معاشرہ اور کردار دو متضاد حقیقتیں ہیں۔ انسانی معاشرے کی بنیاد جبر پر ہے اور کردار کی اختیار پر — مل جُل کر زندگی بسر کرنا انسان کی فطرت ہے۔ ہزار کوشش کے باوجود ہم اپنی اس فطرت کو بدل نہیں سکتے، چنانچہ معاشرہ انسان کی مجبوری ہے۔ اس کے برعکس کردار انسان کے مجبورِ محض ہونے کو ظاہر نہیں کرتا۔ اُس میں اس کے اختیار کو بڑا عمل دخل ہے۔

اب یہ بالکل الگ مسئلہ ہے کہ معاشرے اور کردار کا یہ بُنیادی تضاد ان دونوں میں نفاق نفاق یا بُعد کا باعث نہیں بنتا۔ معاشرہ اور کردار آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک جسم ہے، تو دوسرا رُوح — جس طرح رُوح کے بغیر جسم بے جان ہو جاتا، اسی طرح کردار کے بغیر معاشرہ بھی اپنی حقیقی صورت کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔

حُکمانے کردار کی تعریف کچھ اس طرح سے کی ہے۔ کردار نام ہے جذبے، ارادے اور عقل کی اُن امتیازی صفات کے مجموعے کا، جس سے ایک انفرادی ذہن تشکیل

پاتا ہے۔ یہ تعریف کس حد تک مکمّل ہے؟ ہم فی الحال اِس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے، البتّہ اِس تعریف کے پیشِ نظر ہمیں اتنا ضرور پتہ چل جاتا ہے کہ کردار اور ذہن ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ کسی فرد کا کردار بالکل ویسا ہی ہوتا ہے جیسا اُس کا ذہن۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجیے کہ ذہن کردار کی پوشیدہ صورت ہے اور کردار، ذہن کی آشکار شکل۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہمارے ذہن اور کردار میں ہمیشہ تھوڑا یا بہت اختلاف ضرور قائم رہتا ہے۔ ہم جو سوچتے ہیں اُس پر عمل نہیں کرتے۔ دراصل جو لوگ کردار اور ذہن کو اس طرح دو مختلف خانوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، وہ اِس نفسیاتی حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں کہ صرف سوچ لینے کو ذہن نہیں کہتے۔ جب تک فکر و عمل ایک دوسرے سے جُدا رہتے ہیں ذہن سے اُن کا کوئی سروکار نہیں ہوتا، فکر و عمل میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے، تو ذہن وجود میں آتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ہم ذہن سے علیحدہ ہو کر سوچتے رہیں۔ بلکہ اگر سچ پوچھیے تو ذہن سے علحدہ ہو کر سوچنا آسان ہے، ذہن سے الگ ہو کر عمل کرنا آسان نہیں اور عام حالات میں تو قریب قریب ناممکن سمجھیے ـــ ہم ذہن سے علحدہ ہو کر بہت کچھ سوچ سکتے ہیں اور سوچتے رہتے ہیں۔ ہماری سوچ کا بیشتر حصّہ ہمارے ذہن کا جزو کیوں نہیں بنتا؟ دراصل یہ ہے وہ سوال جس پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ درست ہے کہ عقل کے علاوہ جذبہ و ارادہ بھی تشکیلِ ذہن میں بہت بڑا رول ادا کرتے ہیں، لیکن چونکہ عقل، جذبہ و ارادہ کے رُخ متعیّن کرنے میں پیش پیش رہتی ہے اس لیے ذہنی ساخت و پرداخت میں اِس کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ دوسری فطری مجبوریوں کی طرح سوچ بچار بھی ہماری ایک مجبوری ہے، ایک جبلّت ـــ ہماری زندگی کا کوئی لمحہ سوچ کے بغیر نہیں گزرتا۔ لیکن جب تک سوچ ہمارے ذہن کا جزو نہیں بنتی اُس

سے ہمیں کسی قسم کا فیض نہیں پہنچتا ـــــ فکر ایک جبلّت ہے، لیکن اگر یہ جبلّت، صلاحیت بن جائے، تو عقل کہلاتی ہے اور ذہن اِس سے خاطر خواہ متاثر ہوتا ہے۔ جبلتِ فکر کا صلاحیّت میں تبدیل ہونا ہی دراصل سوچ کے جزوِ ذہن بننے کی ابتدا ہے۔ ہماری سوچ میں فی نفسہٖ کوئی صداقت ہو یا نہ ہو، ہم جب بھی کسی سوچ کو اپنے ذہن کا جزو بناتے ہیں، تو اُسے بطورِ صداقت ہی قبول کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک بات کو ہم جھوٹی بھی سمجھ رہے ہوں اور وہ ہمارے ذہن کا جزو بھی بن جائے۔ ہم سمجھنے میں غلطی کر سکتے ہیں اور عموماً کر جایا کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں جھوٹی باتیں بھی سچّی بن کر ہمارے ذہن کا جزو بن جاتی ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہماری کوئی سوچ اُس وقت تک ہمارے ذہن کا جزو نہیں بنتی جب تک ہمیں اُس کی سچّائی کا یقین نہیں ہو جاتا ـــــ انسان اپنی سوچ کو جن معیاروں کے ذریعے صحیح معنوں میں صداقت کا درجہ بخشتا ہے وہ ہیں تجربہ، علم اور عقیدہ ـــــ لیکن ان تین حقیقی معیاروں کے علاوہ ایک اور بھی معیار ہے جو غیر حقیقی ہونے کے باوجود عام حالات میں بڑا مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے، تو زیادہ صحیح ہے کہ عموماً یہ معیار دوسرے تین بڑے حقیقی معیاروں کے زور اور توانائی کو چشم زدن میں غیر مؤثر بنا کر رکھ دیتا ہے ـــــ ہم اِس معیار کو سہل انگاری یا تن آسانی کا نام دے سکتے ہیں ـــــ انسان نے اکثر سہل انگاری کے سامنے اپنے تجربے، علم اور عقیدے کے بڑے بڑے چراغوں کو گل کرنے سے دریغ نہیں کیا۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تجربہ، علم اور عقیدہ تو ہوئے صداقتِ فکر کو پرکھنے کے حقیقی معیار، یہ سہل انگاری کا معیار کیا بلا ہے جو غیر حقیقی ہونے کے باوجود حقیقی معیاروں کو غیر مؤثر بنا دیتا ہے اور فکرِ صحیح کو ہمارے ذہن کا جزو نہیں ہونے دیتا۔ عقیدے کی طرح علم و تجربہ بھی ہماری ذمہ داریوں میں شامل ہیں۔ ان معیاروں کے ذریعے ہم اپنی جس

سوچ کو بھی جزوِ ذہن بنانا چاہیں گے، ہمیں اس کے لیے کسی نہ کسی نوع کی ذمّہ داری کا بوجھ اُٹھانا پڑے گا۔ ذمّہ داری کا بوجھ اُٹھانا یوں تو انسان کے خود مختار ہونے کی دلیل ہے لیکن انسان خود مختار ہونے سے خوف کھاتا ہے ۔۔۔ خوفِ مختاری کی وجہ خواہ کچھ ہو، سہل انگاری اس کا سب سے بڑا آلۂ کار ہے ۔۔۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا ہے، عقیدہ کی ذمّہ داری ہو یا علم و تجربہ کی ذمّہ داری، ان سب کا مقصد انسان کو صاحبِ اختیار بنانا ہے اور سہل انگاری کا کام ان سب ذمّہ داریوں کو وہم اور لغو قرار دینا ہے۔ سہل انگاری کے پاس جواز کے بے شمار نسخے ہوتے ہیں، جن کے جادو جگا کر وہ ہر طرح کی صداقت کا مذاق اُڑاتی رہتی ہے۔ ایسی صورت میں شوخی اور ظرافت بھی سہل انگاری کا ایک حربہ بن جاتا ہے۔ مجھے اس وقت غالب کا یہ مشہور شعر یاد آ رہا ہے ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد

پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

یہاں غالب کا علم اور عقیدہ دونوں ہی اس کے ذہن کی حدوں سے باہر غربت کے عالم میں کھڑے نظر آ رہے ہیں۔ علم جب تک یقین کی صورت اختیار نہیں کر لیتا وہ ذہن کا جزو نہیں بن پاتا۔ اگر غالب جاننے کے ساتھ طاعت و زہد کے ثواب کو مان بھی لیتے، تو ان کی طبیعت ضرور اس طرف مائل ہو جاتی۔ میرا مقصد شعر کے حُسن اور اندازِ بیان کی خوبی سے انکار کرنا نہیں ہے، میں تو شعر کے صرف نفسیاتی پہلو کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اسی شعر کے ساتھ مجھے غالب کا ایک اور مشہور شعر یاد آ رہا ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کُفر

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

میں سمجھتا ہوں انسان کی زندگی کا المیہ اُس کا مجبور ہونا نہیں ؛ بلکہ مختار ہونا ہے۔ اگر اُس کی خلقت میں اختیار کا عنصر بطورِ خاص شامل نہ کیا جاتا، تو اُس کی زندگی بڑے آرام سے گزرتی۔ مشکل یہ ہے کہ جو چیز اُسے بطورِ خاص ودیعت ہوئی ہے اُسی سے وہ جی چراتا ہے۔ غالب کے اِس شعر میں ایمان کے لیے روکنے اور کُفر کے لیے کھینچنے کے الفاظ بڑے واضح اور دلکش انداز میں انسان کے گُریز اور نفسیاتی کشمکش کا اظہار کر رہے ہیں۔ اِسی طرح یہ کہنا کہ کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے۔ انسانی نفسیات کی طرف بڑے بلیغ اشارے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس شعر میں کعبہ اختیار کی علامت ہے اور کلیسہ جبر کی۔ نفسیاتی احوال کے پیشِ نظر یہاں ایمان اور کفر بھی اختیار اور جبر کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ انسان اپنی جبلی مجبوریوں کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھتا ہے اور اُنھیں میں کشش محسوس کرتا ہے اس کے برعکس اختیار کی ذمہ داریوں کو پسِ پُشت ڈالتا ہے اور اُن سے جان بچانا چاہتا ہے، لیکن چونکہ اختیار اُس کی گھٹی میں پڑا ہے، اِس لیے وہ اُس سے دامن بھی نہیں چھڑا سکتا۔ قصہ در اصل یہ ہے کہ انسان خیر و شر یا نیک و بد کی کشمکش میں اتنا مُبتلا نہیں ہے جتنا کہ نفسیاتی طور پر اختیار و جبر کی کشمکش اُسے بے حال کیے ہوئے ہے۔ بغور دیکھا جائے، تو اُس کی ساری بے چینیوں کا سبب اِسی کشمکش میں پوشیدہ ہے۔ غالب ہی کی زبان میں ہم اس کشمکش کو آدمی اور انسان کی کشمکش کہہ سکتے ہیں۔ تشکیلِ کردار اِس کشمکش کو حل کرنے کی ایک کوشش ہے۔ آدمی سے انسان تک پہنچنے کا سفر، جبر سے اختیار کی طرف آنے کا سفر ہے۔ اِس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ آدمی کا انسان بننا جبر کو اختیار میں ڈھال دینے کے مترادف ہے۔

دراصل انسانی معاشرے کا وجود ہی اِس لیے عمل میں آیا کہ انسان تنہا جبر و اختیار

کی اس کشمکش سے عُہدہ برآنہیں ہوسکتا تھا۔ مجبوریوں کو مختاریوں میں بدل دینا ممکن تو ہے، لیکن یہ ایک انسان کے بس کا روگ نہیں ——اِس کے لیے دوسرے کا سہارا ناگزیر ہے۔ گویا انسانی معاشرے کا مقصد اُسی وقت پُورا ہوسکتا ہے جبکہ اُس کے افراد میں اپنی فطری مجبوریوں پر قابو پانے کی سکت پیدا ہو جائے۔ صاحبِ اختیار ہونے کے لیے صاحبِ کردار ہونا لازمی ہے اور صاحبِ کردار ہونے کے لیے ایک حق آگاہ ذہن کی ضرورت ہے۔ ذہن کو حق آگاہی اُس وقت نصیب ہوسکتی ہے جبکہ وہ اپنی سوچ کو سہل انگاری کے قریب نہ آنے دے۔ سہل انگاری، حق کو ناحق اور ناحق کو حق بناکر دکھایا کرتی ہے۔ ذہن کی ساخت و پرداخت میں جس ہوشمندی کی ضرورت ہے وہ یہی ہے کہ اس پر سہل انگاری کا سایہ تک نہ پڑے۔ سہل انگاری ذہن پر ذرا بھی مسلّط ہوجائے تو کوئی بڑے سے بڑا خیال اُس کے نزدیک نہیں آسکتا۔ یہاں یہ سوال اُٹھایا جاسکتا ہے کہ خود اِس خیال میں اتنا زور کیوں نہیں ہے کہ وہ سہل انگاری کے طلسم کو توڑ کر ذہن کا حصّہ بن جائے۔ جیساکہ میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کسی سوچ کی صداقت، عظمت اور نُدرت اُس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک وہ ذہن کا حِصّہ نہیں بن جاتی اور سوچ میں توانائی تو خاص طور سے اُسی وقت آتی ہے جب وہ ذہن کا جزو بنتی ہے۔ چنانچہ معاشرے کے استحکام کا تمام تر انحصار افراد کے ایسے ذہن و کردار پر ہے جسے سہل انگاری کی ہوا تک نہ لگی ہو اور ابتدا سے جفاکشی جس کا شعار رہا ہو۔ ویسے مجموعی حیثیّت سے دیکھا جائے، تو انسان نے ابھی تک مِل جُل کر زندگی بسر کرنا زیادہ طور پر جبر کے تحت ہی قبول کیا ہے۔ عموماً ہم ایک دوسرے سے مجبور ہوکر ملتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ معاشرتی اعتبار سے انسان ابھی ارتقا کے ابتدائی درجوں میں ہے اور جسے ہم انسانی معاشرہ کہتے ہیں، اُس نے تاحال اپنے

مفہوم کو پُوری طرح نہیں پایا۔ معاشرے کو جو چیز بامعنی بناتی ہے وہ مضبوط کردار ہے۔ مضبوط کردار انسان کو با اختیار ہو کر چلنا اور زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے اور یہی وہ واحد عمل ہے جس کے ذریعے ہم پر زندگی کے جلال وجمال کی صداقتیں آشکار ہوتی ہیں۔

چھوئی موئی

ہر انسان کی ذات میں چھوئی موئی کا ایک پودا چھپا ہوا ہے — میرا مطلب ہے کوئی شخص بھی چھوئی موئی کی طرح سمٹ جانے والی خاصیت سے محفوظ نہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اِس خاصیت کا پتہ چلانے کے لیے کہیں ہلکی سی پھونک مارنا کافی ہوتا ہے اور کہیں ذرا ہاتھ لگانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اپنی ذات میں سمٹنا ہر کوئی ہے، البتہ اس سمٹنے کے رنگ بڑے انوکھے اور نرالے ہوتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ سمٹتے وہ لوگ بھی ہیں جنھیں ہم آپ چکنے گھڑے کہتے ہیں۔

ممکن ہے چھوئی موئی کے پودے کی خاصیت یعنی سمٹ جانے کو آپ شرم و حیا سے تعبیر کرتے ہوں، لیکن میرے خیال میں اس سمٹنے میں شرم و حیا والی بات قطعی نہیں پائی جاتی۔ شرم و حیا کی حالت میں تو انسان اپنے آپ کو مجتمع کرتا ہے اور چھوئی موئی کا پودا سمٹ کر خود کو مجتمع نہیں کرتا۔ انسان کے حوالے سے میں تو اِس کیفیت کو بے یقینی کی کیفیت قرار دیتا ہوں۔ جس وقت انسان چھوئی موئی کی طرح سمٹنے لگے، سمجھ لیجیے اُسے خود پر اعتبار نہیں رہا وہ اپنے گرد و پیش سے ڈر رہا ہے۔

ہو سکتا ہے آپ کو انسانوں کی یہ چھوئی موئی کے پودے کی طرح اچانک سمٹ

جانے والی ادا بھلی لگتی ہو مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ لوگوں کو اِس طرح سمٹتا ہوا دیکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ نباتات کے درجے میں داخل ہو کر گھاس پھونس بن گئے ہیں۔

شاید آپ اس بات پر بھی حیران ہوں کہ مجھے چھوئی موئی کا پودا اُس وقت بہت یاد آتا ہے جب میرے سامنے کسی شخص پر غصّے کی حالت طاری ہوتی ہے۔ اِسی طرح کسی مغرور اور متکبر شخص کو دیکھ کر بھی مجھے بے اختیار چھوئی موئی کے پودے کا خیال آتا ہے۔ غصّہ ہو یا تکبّر دونوں صورتوں میں انسان کے بے یقین ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ دونوں صورتیں انسان کی بے چارگی کو ظاہر کرتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ غصّے میں بے چارگی واضح ہوتی ہے تکبّر میں ذرا پوشیدہ۔

جب میں کسی شخص کو غصّے میں ہاتھ پاؤں چلاتے، آنکھیں نکالتے، منہ پھُلاتے اور آگ بگولہ ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں، تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بہت زور سے آندھی چل رہی ہے اور غریب چھوئی موئی کا پودا اپنی ذات میں سمٹنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔ غصّے سے بھرے ہوئے اِس شخص کے چلتے ہوئے ہاتھ پاؤں نہ ہاتھ پاؤں رہ جاتے ہیں نہ اُس کا پھُولا ہوا مُنہ، مُنہ نظر آتا ہے اور نہ ہی اُس کی اُبلی ہوئی لال سُرخ آنکھیں، آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔ بس یوں سمجھیے اُس کا تمام جسم تیز ہوا کا ایک جھونکا بن جاتا ہے اور اُس کی ذات چھوئی موئی کے پودے کی طرح سمٹ کر کہیں غائب ہو جاتی ہے۔

مغرور شخص کے ساتھ بھی کچھ اِسی طرح کا معاملہ ہے۔ اکڑی ہوئی گردن اور سُوجھا ہوا مُنہ اِس بات کی دلیل ہیں کہ یہ صاحب کسی کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیں گے۔ سچ پوچھیے تو مغرور شخص چھوئی موئی کے پودے سے بھی زیادہ کوئی بے یقین مخلوق ہوتا ہے۔ چھوئی موئی کے پودے کو آپ خواہ کتنا ہی بے اعتبار اور تنگی المزاج کہہ لیں، لیکن وہ اپنے عام رویّے سے

یہ کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتا کہ کوئی اُسے ہاتھ نہ لگائے۔ اِس چھوٹے سے پودے کی نہ کبھی گردن اکڑتی ہے اور نہ کبھی مُنھ سُوجھتا ہے۔ غرض مغرور اور غُصیلے آدمی کی ذات میں چھوئی موئی کے پودے کو تلاش کر لینا کوئی مشکل کام نہیں۔ دقّت تو وہاں پیش آتی ہے جہاں انسان متکبّر ہوتا ہے نہ غُصّے والا۔

ہمارے ایک نہایت عزیز دوست ہیں جن کے نام کے دونوں لفظ م سے شروع ہوتے ہیں اور اگر اُن کی پروفیسری کو بھی اُن کے نام کا جُز سمجھا جائے تو پھر وہ پ۔م۔م۔ بن جاتے ہیں، لیکن ہم اُنھیں پروفیسر ڈبل میم کہا کرتے ہیں۔ یہ بہت ہی نستعلیق قسم کے انسان ہیں دوستوں کے دوست، ہمدرد، درویش منش، عالم و فاضل، محبّت اور شرافت تو گویا اُن کے چہرے سے یوں ٹپکتی ہے جیسے اِن دو صفات کا منبع ہی اُن کی ذات ہے۔ جب ہم نے پروفیسر صاحب کو دیکھا اور اُن کے ساتھ رہتے ہوئے کافی مُدّت گزر گئی، تو ہمیں اپنے قائم کیے ہوئے کُلیے پر شک ہونے لگا — ہم سمجھتے تھے ہر انسان میں چھوئی موئی کا ایک پودا ضرور ہوتا ہے، لیکن پروفیسر کی ذات سے یہ پودا کہاں غائب ہو گیا؟ لوگوں نے ہمیں بتایا کہ پروفیسر صاحب بہت شریف آدمی ہیں، لیکن ذرا خشک واقع ہوئے ہیں، غیر سنجیدہ بات کو اچھّی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ہم نے سوچا بس یہاں پانی مرتا ہے، پروفیسر صاحب سے کوئی دل لگی کی جائے، اِن کی ذات میں پوشیدہ چھوئی موئی کے پودے کا پتہ چل جائے گا، چنانچہ ہم نے اُن سے مذاق شروع کر دیا، پہلے ڈرتے ڈرتے پھر بے باکی کے ساتھ، لیکن وہ تو اِس میدان کے بھی مردِ عالی حوصلہ ثابت ہوئے۔ ہم ایک مذاق کرتے، پروفیسر صاحب جواب میں دس مذاق کر جاتے۔ ہم حیران تھے کہ یہ آدم زاد ہے یا کوئی آسمانی مخلوق۔ لیکن ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ہماری زبان سے ایک لفظ کا تلفّظ غلط نکل گیا۔ پروفیسر صاحب نے فوراً ٹوکا: اس

لفظ کا تلفظ یہ ہے"۔ اتّفاق سے ہمیں اُس لفظ کے معنی بھی اچھّی طرح نہیں آتے تھے؛ چنانچہ نہایت خلوص کے ساتھ پوچھا"حضور! جہاں تلفظ کی تصحیح فرمائی ہے، اس لفظ کے معنی بھی بتا دیجیے"۔ بس پھر کیا تھا ناراض ہو گئے ـــ بولے"اِس کا یہ مطلب ہے تم ہمارا امتحان لے رہے ہو"۔ ہم نے ہزار منّت سماجت کے ساتھ قسمیں کھا کر کہا"بالکل نہیں، صرف اپنی جہالت دُور کرنا مقصد ہے"۔ لیکن پروفیسر صاحب نے ایک نہ سُنی اور ہمیں ڈانٹتے چلے گئے۔ دراصل اُنھیں خود اِس لفظ کے معنی پوری طرح معلوم نہیں تھے۔ معلوم ہوتے، تو شاید وہ ناراض نہ ہوتے۔ بہرحال ہمیں اُن کی ذات میں چھوئی موئی کا پودا نظر آ گیا تھا کچھ روز بعد یہ پتہ بھی چلا کہ پروفیسر صاحب مذہب پر گفتگو کرتے وقت بھی برداشت سے کام نہیں لیتے۔

تکبّر اور غُصّے کے علاوہ انسان کی ذات میں چھوئی موئی کے پودے کی ایک واضح صورت مشیخت بھی ہے۔ جو لوگ بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے ہیں اور بات بات میں شیخی بگھارتے ہیں، سمجھ لیجیے اُن کی ذات بھی نری چھوئی موئی کا پودا ہے۔ ذرا اُن کی بات کاٹ دیجیے پھر دیکھیے وہ کس طرح یک لخت بُجھ کر رہ جاتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو، تو اُن کا دوسرا ردِّعمل یہ ہوتا ہے کہ اُن کی ڈینگ کی ہینگ اور اونچی ہو جاتی ہے۔ کسی کو کیا معلوم چھوئی موئی کا پودا آسمان کے تارے ہی نہیں توڑ لاتا، پورے آسمان کو ہڑپ کر جاتا ہے۔

بہت سے لوگ دوسرے لوگوں کی ذات میں چھوئی موئی کا پودا تلاش کرتے رہتے ہیں اور اُنھیں اِس تگ و دو میں ایک خاص طرح کی لذّت بھی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے قطعی بے خبر ہوتے ہیں کہ اِس دوران میں خود اُن کی ذات میں چھوئی موئی کا پودا پھیل کر کس قدر بھیانک بن چکا ہے۔ ہم نے ایسے افراد بھی دیکھے ہیں جو تنہا اپنی ذات

میں چھوئی موئی کا ایک جنگل ہوتے ہیں۔۔۔اُن کا مِلنا جُلنا، چلنا پھرنا، اُٹھنا بیٹھنا سب کا سب چھوئی موئی بن جاتا ہے۔ اگر یہ لوگ دوسروں کی ذات میں چھوئی موئی کی تلاش کرنے کے بجائے اپنی ذات کے چھوئی موئی کو دیکھنے کی کوشش کرتے، تو یقیناً اِن کا یہ حال نہ ہوتا۔

کہتے ہیں خود غرض اندھا ہوتا ہے، لیکن خود غرضی ایک آئینہ بھی تو ہے جس میں انسان کو اپنی ذات کے بہت سے پہلو نہایت واضح طور پر نظر آجاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں انسان کی ذات میں چھوئی موئی کا پودا اُسی وقت در آتا ہے جب وہ پہلی بار اِس آئینے میں اپنی صورت دیکھتا ہے۔ ممکن ہے آپ انسانی ذات کے حوالے سے چھوئی موئی کے پودے کی کوئی اور تاریخ بیان کریں، میں نے تو جب بھی خود غرضی کے آئینے میں جھانک کر دیکھا ہے، اپنی ذات کو چھوئی موئی کے پودے کی طرح پھیلتے اور سمٹتے ہوئے پایا ہے۔

انسان کو اپنی ذات کا اندیشہ کمزور ہی نہیں کرتا، طاقتور بھی بنا دیتا ہے۔۔۔اسی لیے اولادِ آدم نے آپس کی بیشتر جنگیں خوفِ ذات سے حاصل کی ہوئی طاقت کے بل بوتے پر لڑیں ہیں، چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تاریخِ عالم کے بے شمار فاتحین کی حیثیت کسی طرح بھی ایک چھوئی موئی کے پودے سے زیادہ نہ تھی۔

قصّہ دراصل یہ ہے کہ یہ تو ممکن ہے انسان کی ذات میں چھوئی موئی کا پودا پروان نہ چڑھے، لیکن یہ ممکن نہیں کہ اِسے جڑ سے اُکھاڑ کر ہی پھینک دیا جائے۔ کسی نہ کسی رنگ میں یہ موجود ضرور رہتا ہے۔ البتّہ انسان کی ذات میں اس کے پروان چڑھنے کی بے شمار صورتیں ہیں۔ چھوئی موئی کا پودا انسان کو غنڈہ گردی پر اُبھار سکتا ہے، اُسے ڈاکو بنا سکتا ہے، قتل و غارت پر مجبور کر سکتا ہے، مکّاری اور عیّاری کی راہوں پر ڈال سکتا ہے۔ غرض کونسی انسانی بُرائی ہے جس کے عقب میں چھوئی موئی کا پودا کارفرما نہیں ہوتا۔۔۔جبر و تشدّد، ظلم و ستم، سفاکی و

بے رحمی یہ سب صفات چھوئی موئی کے پودے کے مختلف رنگ روپ ہیں۔ انسان بے چارے کو جب غلط یا صحیح طور پر یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اُس کی ذات کسی خطرے کی زد میں آ رہی ہے، تو پھر وہ چور، اُچکا، سفاک، بے رحم اور قاتل سبھی کچھ بن جانا قبول کر لیتا ہے۔ بے معنی قسم کے خوف انسان کی ذات میں چھوئی موئی کے پودے کو پروان چڑھاتے ہیں۔ انسان کی دُنیاداری بھی چھوئی موئی کے پودے کی مرہونِ منت ہے۔ دُنیادار لوگ چھوئی موئی کے پودوں کی لہلہاتی کیاریاں ہوتے ہیں۔ چھوئی موئی کے پودے کی ایک صُورت انسان کا کٹڑپن بھی ہے۔ کٹڑ خیالات کے لوگ کسی کی بات سُننے کو تیار نہیں ہوتے اور وہ یوں اپنے گرد اتنی اونچی اونچی دیواریں کھڑی کرتے چلے جاتے ہیں کہ اُن کی ذات کو نہ کوئی ہوا کا تازہ جھونکا چھونے کی ہمت کر سکتا ہے اور نہ ہی سورج کی کوئی معمولی سی کرن اُن کی آنکھوں میں در آنے کی گستاخی کر سکتی ہے۔ لیکن تازہ ہوا اور روشنی کے فقدان کے باوجود اُن کی ذات میں چھوئی موئی کا پودا اس قدر گھنا اور ڈراؤنا درخت بن چکا ہوتا ہے جس کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اِس پر بے شمار چڑیلیں رہتی ہیں اور جس کسی نے بھی اِس کے پاس جانے کی جسارت کی وہ اِسے کچا ہی چبا ڈالیں گی۔ کہتے ہیں چھوئی موئی کی اِس بھیانک صورتِ حال کا تیر بہدف نسخہ عاشقوں کے پاس ہے، جو لوگ عاشقوں کی سیوا کرتے ہیں وہ اِس بلا سے محفوظ رہتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا نہایت پُرخلوص مشورہ یہی ہے کہ آپ کسی عاشق کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں اور اگر اس تلاش میں آپ خود عاشق بن جائیں، پھر تو کیا کہنا سُبحان اللہ لُطف آ جائے۔

غالبِ خستہ کے بغیر.....

کائنات عالم اشیاء سے معمور ہے۔ شے نے سارے زمان و مکان پر قبضہ جما رکھا ہے۔ خلا کا تصور ایک واہمہ ہے۔ لیکن شے سے بڑھ کر بھی ایک مخلوق ہے جسے عرفِ عام میں آدمی کہتے ہیں۔ آدمی کا شے سے بڑھ کر ہونا کیا معنی رکھتا ہے، یہ ایک الگ سوال ہے، مگر اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ آدمی میں شیئیت کا فقدان ہے۔ وہ شے بھی ہے اور آدمی بھی۔ آدمی کی سب سے بڑی مصیبت یہی امتزاج ہے۔ آدمی محض شے ہوتا، تو کوئی مضائقہ نہ تھا اور آدمی صرف آدمی ہوتا پھر بھی کچھ نہیں بگڑتا۔ سارے نزاع کا باعث آدمی اور شے کا ایک جان ہو جانا ہے۔ نہ شے آدمی سے جدا ہے نہ آدمی شے سے۔

آدمی اور شے کا امتزاج، تو ایک حقیقت ہے، لیکن اس حقیقت سے انحراف نے کیا کیا صورتیں اختیار کی ہیں، اس بوالعجبی کو کیا کہا جائے؟ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس امتزاج کو کائنات کا ذرہ ذرہ تسلیم کرتا ہے، کوئی نہیں مانتا تو وہ آدمی کی ذات ہے۔ اگر آدمی اس امتزاج سے پوری طرح انکار کر دے اور خود کو صرف شے مان لے، پھر بھی بڑی خیریت گزر سکتی ہے۔ وہ پوری طرح انکار بھی تو نہیں کرتا۔ سچ پوچھیے تو وہ ایسا کر بھی نہیں سکتا۔ یہ اُس کے بس کی بات نہیں۔ اگر اُس کے بس کی بات ہوتی تو وہ انکار کر کے شے کی نرم و گرم

آغوش میں کبھی کا تحلیل ہو گیا ہوتا۔ ستاروں کی چمک اُس کی چمک اور دریاؤں کی روانی اُس کی روانی ہوتی۔ پھولوں کی مہک اُس کی مہک اور ہواؤں کی جولانی اُس کی جولانی کے نام سے موسوم کی جاتی۔ ممکن ہے اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ستاروں کی چمک، پھولوں کی مہک، دریاؤں کی روانی، ہواؤں کی جولانی آدمی ہی کی چمک، مہک، روانی اور جولانی ہے۔ لیکن بغور دیکھا جائے، تو ایسا نہیں ہے۔ اشیا کی چمک، دمک، مہک، روانی اور جولانی آدمی کے ہوش و حواس پر دستک ضرور دیتی ہیں، لیکن اس دستک کا جواب کیا ملتا ہے، اس کا دارومدار قطعی طور پر آدمی کے اپنے موڈ پر ہے۔ ستاروں، پھولوں، دریاؤں اور ہواؤں کو آدمی اپنے کام میں تو لاتا رہتا ہے، اُن کے کام آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اشیا کے حضور میں آدمی کی یہی تمکنت اُس کی رفعت اور بلندی کو ظاہر کرتی ہے۔ شے مجبور ہے۔ اب چونکہ آدمی میں شے بھی موجود ہے، اس لیے آدمی بھی قیدِ جبر سے آزاد نہیں۔ شے آدمی کے پاؤں کی زنجیر ہے۔ اس زنجیر کو کوئی کہاں تک توڑ سکتا ہے یا اسے ساتھ لے کر کہاں تک بلند ہو سکتا ہے اپنی اپنی ہمّت پر موقوف ہے۔ ویسے اس زنجیر کو توڑ کر قطعی طور پر اس سے الگ ہو جانا شاید کوئی بھی پسند نہ کرے۔ پاؤں سے نکال کر اسے گلے کا ہار بنانے کی خواہش اکثر و بیشتر کو ہوتی ہے اور غالباً یہ سب سے زیادہ آسان کام ہے۔ اس میں ہلدی پھٹکری تو واقعی کچھ نہیں لگتی، لیکن رنگ بھی چوکھا نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے آدمی سب کچھ پا کر بھی کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ پاؤں کی چیز کو گلے تک پہنچایا اور پھر بھی کوئی بات نہیں بنی، اُسے سخت اذیّت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اب وہ کسی سے کچھ کہنے کے قابل نہیں رہتا۔ خود کردہ را علاجے نیست۔

اس تمہید سے میرا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے انسان بننے کے لیے فطری طور پر کچھ قدریں تخلیق یا دریافت کیں اور پھر ان قدروں کے سہارے وہ دیگر اشیاء عالم سے ارفع و

اعلیٰ ہوگیا۔ یہ قدریں آدمی کے شعور کا ثمرہ ہیں۔ ان قدروں کی بدولت وہ کائنات کو سمجھنے اور برتنے سے زیادہ اپنا صحیح مقام متعیّن کرتا ہے۔ اپنا صحیح مقام متعین کرتا ہے۔ اپنا صحیح مقام متعیّن کرنے کے بعد آدمی دوسرے موجوداتِ عالم سے بلند تو ہو جاتا ہے، لیکن یہ بلندی اُس کے لیے بے شمار درد و کرب لے کر آتی ہے۔ انسانی بلندی کا پہلا کرب تو یہی ہے کہ دیگر مخلوق سے آدمی کا روّیہ دردمندانہ ہو جاتا ہے۔ وہ غیر ذات کو اپنے سے پست خیال نہیں کرتا۔ اُس کی نظر اُس کے روشن پہلوؤں پر زیادہ پڑتی ہے۔ اُسے غیر ذات کا حسن اپنی ذات کا آئینہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ گویا بلند ہو کر یا اپنے صحیح مقام پر پہنچ کر آدمی میں عجز پیدا ہو جاتا ہے۔ جسے اگر حیا کا نام دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ یہ حیا اُسے دیگر اشیا کو محبت کی نظر سے دیکھنا سکھاتی ہے اور یوں بلند و اعلیٰ آدمی کا روّیہ غیرِ ذات سے عاشقوں کا سا ہو جاتا ہے۔

غیرت مندی اور راستبازی ہو یا ہمدردی اور انصاف، یہ سبھی قدریں خود آگاہی بخش کر آدمی کو انسان بناتی ہیں، لیکن اُس میں خستگی بھی پیدا کرتی ہیں۔ خستگی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان قدروں میں بذاتِ خود کوئی خرابی موجود ہے، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی زیادہ تعداد اشیا سے چپک کر رہ جاتی ہے۔ وہ شے سے بلند ہونے کی ہمّت نہیں رکھتے یا اپنی ہمت کو بروئے کار نہیں لاتے۔ جب ایسے بے شمار لوگ محض چند افراد کو شے سے بلند ہوتا دیکھتے ہیں تو اُن میں ایک طرح کا حسد پیدا ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں اکثریّت اقلیّت کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچاتی ہیں۔

انسانی رفعت کا یہ المیہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ ارفع و اعلیٰ نفوس پہ تو جو گزرتی ہے سو گزرتی ہے۔ جب ان کا وجود ناپید ہونے لگتا ہے، تو اکثریّت کو بھی اس کا احساس تنگ کرتا

ہے۔ اعلیٰ انسانی قدروں کے علمبردار جب تک نظر آتے ہیں، لوگ انھیں مسلسل تکلیفیں پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہونے لگتے ہیں، تو ان کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اگرچہ یہ احساس اہلِ دُنیا کے معمولاتِ حیات میں کوئی رخنہ نہیں ڈالتا اور اُن کی دنیاوی کامیابیوں پر بھی اثر انداز نہیں ہوتا، تاہم اُن میں وہ ایک خلش ضرور پیدا کر دیتا ہے۔ بظاہر یہ خلش نہایت معمولی ہوتی ہے لیکن اُن کی زندگیوں سے سچی خوشی بلاشبہ چھین لیتی ہے۔ آدمی کتنا بھی اشیا کا ہو کر رہ جائے اُسے کسی نہ کسی لمحے اپنے انسان ہونے کا خیال آ ہی جاتا ہے۔ طنزیہ انداز میں غالب نے اسی انسانی صورتِ حال کا اظہار اپنے اس مقطع میں کیا ہے ؎

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

یہاں غالبِ خستہ انسانی اقدار کے اُن علمبرداروں کی نمائندگی کر رہا ہے، جنھیں دُنیا والے جیتے جی چین کا سانس نہیں لینے دیتے اور جب وہ اُن میں موجود نہیں رہتے، تو پھر اُن کے لیے واویلا مچاتے ہیں۔ لیکن یہ واویلا بھی ایک حد سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس واویلا کا اتنا اثر کبھی نہیں ہوتا جس کی وجہ سے اہلِ دُنیا کے کاروبار میں کوئی فرق آجائے۔

میں جب بھی غالب کا یہ مقطع پڑھتا ہوں، میرے ذہن میں بچوں کی طرح بار بار یہ سوال اُبھرتا ہے، آخر انسانی اقدار کے اپنانے والوں کو یہ دُنیا چین سے کیوں نہیں رہنے دیتی ؟ کیا آدمی بھی کائناتِ عالم کی دوسری اشیا کی طرح محض ایک شے ہے ؟ کیا شے سے بلند ہونے کا خیال اُس کے ذہن میں بطور حادثہ وارد ہو گیا تھا ؟ کیا انسانی قدریں محض ایک دکھاوا ہیں ؟ یا کہیں انسانی قدروں کو تخلیق کر کے آدمی نے اپنی محدود ذات کو خواہ مخواہ وسیع تر اور غیر محدود بنانے کی کوشش تو نہیں کی ؟ میرے پہلے سوال سے قطع نظر اگر باقی تمام سوالوں کا جواب نفی میں ہے، تو میرا جی

پھر چاہتا ہے کہ میں اُسی بچگانہ استعجاب کے ساتھ پوچھوں کہ ہم اعلیٰ انسانی قدروں کو اپنی زندگی میں کیوں نہیں رچاتے بساتے؟ ان قدروں کو اپنانے میں ہمیں کس لیے دشواریاں پیش آتی ہیں؟ آخر ہم جلدی سے انسان کیوں نہیں بن جاتے؟ اس کارِ خیر میں کونسے استخارہ کی حاجت ہے؟ میں نے اپنے سوالوں کے بچگانہ ہونے کا ذکر پہلے ہی کر دیا ہے۔ عموماً اس نوع کے سوالات کا جواب حکماءِ زمانہ کچھ اس طرح دیا کرتے ہیں "تضادات سے زندگی کا حسن قائم ہے" "تمام لوگ آدمی سے انسان بن گئے، تو پھر انسان کی قدر و منزلت کا پتہ کیسے چل سکے گا؟" "سب کے سب انسانی قدروں کو اپنالیں گے، تو انسانی معاشرے میں یکسانیت پیدا ہو جائے گی اور یکسانیت کا نتیجہ اُکتاہٹ ہے۔ جینے کا تمام تر لطف تضادات کی کشمکش میں ہے۔ یہ کشمکش نہ رہی تو پھر باقی کیا رہا۔ کشمکش کا دوسرا نام غم ہے اور غم کے بغیر زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن میرے بچگانہ تجسس کو ایسے جوابات سے اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر تمام آدمی اعلیٰ انسانی قدروں کو اپنالیں تو کس طرح زندگی میں یکسانیت پیدا ہو کر سپاٹ پن اور بوریت آ جائے گی؟ البتہ یہ خطرہ ضرور ہے کہ نام نہاد غم کا خاتمہ ہو جائے گا اور خوشیوں کا دور دورہ۔ ممکن ہے میرے اس جملے سے آپ کو غالب ہی کا یہ مشہور شعر یاد آ رہا ہو ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اس شعر کے بارے میں عموماً یہی کہا جاتا ہے کہ غالب نے اس شعر میں زندگی اور غم کو اتنا لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ لیکن بغور دیکھئے، تو معلوم ہو گا کہ اس شعر میں بھی غالب کا انداز طنزیہ ہے۔ وہ زندگی اور غم کو اتنا لازم و ملزوم نہیں سمجھتا بلکہ جس طرح ہم کسی ناپسند چیز سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں، لیکن جب نہیں کر پاتے، تو تنگ آ کر کہتے ہیں، اب تو اس کم بخت سے مر

کر ہی نجات حاصل ہوگی، کچھ اسی طرح کا پیرایۂ بیان اس شعر میں پایا جاتا ہے۔ آخر میں لفظ کیوں نے تو طنز کو حد درجہ شدید کر دیا ہے۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ تضادات کو زندگی کی رونق اور حسن سمجھنے والے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جس چیز کو زنگارنگی کہا جاتا ہے وہ تضاد کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی لیے یہاں وہ اندھیرے کے مقابلے میں اُجالے کا نام لیتے ہیں، وہاں یہ بھی کہتے ہیں کہ خوشی کا صحیح احساس غم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ حالانکہ حقیقت کچھ اور ہے۔ زنگارنگی تضاد کا نتیجہ نہیں، بلکہ زندگی کی وسعت اور پھیلاؤ کا دوسرا نام ہے۔ یہ درست ہے کہ زندگی نے ابھی تک ایک ہی قدم اُٹھایا ہے جسے ہم غم کا قدم کہہ سکتے ہیں۔ اس قدم کا فاصلہ اور عرصہ کچھ زیادہ ہی طویل ہوگیا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زندگی اب آگے قدم نہیں اُٹھائے گی اور ہم یہیں رک کر رہ جائیں گے۔ زندگی کا اگلا قدم یقیناً خوشیوں کا قدم ہوگا۔ اس کا امکان اسی حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ آدمی انسانی اقدار کو اپنی زندگی میں پوری طرح رچائے اور بسائے۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ پھر دیکھنے والے دیکھیں گے کہ زندگی خوشیوں سے لبریز ہے اور اُس میں زنگارنگی بھی قائم ہے جو پہلے سے کہیں زیادہ تابناک اور آبرومند ہے۔ جہاں تک نام نہاد غم کا تعلق ہے، اُس کا دُور دُور بھی نشان نہیں ملے گا۔ البتہ غالبِ خستہ کی اہمیت اِس قدر بڑھ جائے گی کہ اُس کے بغیر کاموں کا بند ہو جانا تو معمولی بات ہے، خود زندگی کے کوئی معنی نہیں رہیں گے۔ میں نے غالب کے ساتھ خستہ کی صفت اس لیے برقرار رکھی ہے کہ اس وقت بھی خستگی انسان سے جُدا نہ ہوسکے گی، اگرچہ اُس خستگی کے معنی آج کی خستگی کے معنی سے بالکل مختلف ہوں گے۔

ہرجائی

بد اچھا بدنام برا۔ ناموں کے پیچھے وہ لوگ بھاگتے ہیں، جنھیں کان کھول کر سننے کی عادت نہیں ہوتی۔ کان کھولیں تو بہرے ہو جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ بدنامی کا باعث بدنام اشخاص کے کردار کی نسبت لوگوں کی سہولت پسندی زیادہ ہوتی ہے۔ حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کی تمنّا فطری ہے۔ نقاب کی طرف ہاتھ بڑھانے کا فعل اختیاری۔ لوگ اسی اختیار کو کام میں لانے سے گریز کر جاتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ گریز کی لذت، کام و دہن کو زندگی کے دوسرے بے شمار ذائقوں سے محروم کر دیتی ہے۔

انسانی ذہن کے چند مضحکہ خیز خصائل میں سے ایک خصلت یہ ہے کہ جس چیز کو وہ حاصل نہیں کر پاتا، اس کی تضحیک اور تحقیر شروع کر دیتا ہے۔ اگر یہ چیز بہت ہی عمدہ ہے، تو پھر ذہن کی ہجو گوئی بھی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ چیز جتنی زیادہ خوب ہوتی ہے ذہن اسی قدر اس سے نفرت کی تلقین کرتا ہے۔ ہرجائی کے مفہوم میں بھی کچھ ایسے ہی پیچ پڑے ہوئے ہیں۔ اس لفظ کا بظاہر تاریک پہلو روشن تریں عناصر سے مرکب معلوم ہوتا ہے۔

سمتوں سے حسن اور عشق دونوں آزاد ہیں۔ جس طرح حسن کے لیے کوئی مقام متعین نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح عشق کے لیے بھی یہ لازم نہیں ہے کہ وہ سورج کی طرح مشرق سے

طلوع ہو کر مغرب میں ڈوب جائے۔ جہاں حسن، وہاں عشق۔ حسن اپنے آپ کو مقیّد اور محدود نہیں کر سکتا، تو عشق اس کا تعاقب کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ ہرجائی دونوں ہیں۔ ایک نقطہ کا تصوّر ہی تصوّر ہے، ورنہ نقطہ کہاں ہے، اسے آج تک کوئی نہیں بتا سکا۔ لامحدود کو محدود کرنے کی ناکام کوشش، یہ ہے نقطہ کی ساری داستان۔ ہم تمام کائنات کے حسن کو شے کی چار دیواری میں اس لیے دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہم نے خود کو یقینی طور پر محدود سمجھ لیا ہے۔ حدیں لگا کر ہم اپنی دانشمندی کا اظہار کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنے آپ کو حدوں سے باہر نکال لیں، تو ہم پر زندگی کا ہر راز فاش ہو جائے۔ لیکن لوگ ہمیں پاگل کہنا شروع کر دیں۔ خود کو حدوں سے باہر نکالنا بہت آسان کام ہے اور انسان کی مشکل پسند "طبع غیور" اس آسانی کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ ویسے ہم حدیں قائم کر کے لامحدود ہونا چاہتے ہیں۔

ہرجائی سب ہیں، لیکن کوئی ہرجائی نہیں۔ سب ہرجائی اس لیے ہیں کہ سب کو ہر جگہ کچھ نہ کچھ نظر آتا ہے۔ نگاہ کہاں نہیں ٹھہرتی۔ انسان کو قدرت نے صرف دو آنکھیں دی ہیں اور وہ بھی سامنے۔ لیکن انہی دو آنکھوں سے ہر طرف دیکھا جا سکتا ہے۔ ہم گردن ہی نہیں موڑ سکتے، اپنے پورے جسم کو جھکا اور گھما سکتے ہیں۔ مشرق، مغرب، شمال، جنوب، آسمان، زمین، ہمارا رُخ کس سمت نہیں ہو جاتا۔ حواس پر اطراف کی کوئی قید نہیں ہے۔ کیا دل، کیا دماغ، ہمارا عضو عضو ہرجائی ہے۔ رہا فاصلوں کا غرور، سو اسے ہر اٹھتا ہوا قدم شکست دیتا رہتا ہے۔

پھیلنے میں وسعت ہے، عافیّت نہیں۔ سمٹنے میں عافیّت ہے، وسعت نہیں۔ عافیّت کو ترجیح دے کر لوگ سمٹ جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم کسی کو ہرجائی نہیں کہہ سکتے۔ پھیلنے کے سانحہ میں پہلا تجربہ یہ ہوتا ہے کہ ہم خود کو کمزور محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ناطاقتی کا یہی احساس ہمیں سمٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اگر ہم پھیلنے کے اوّلین تجربہ کی آنچ کو برداشت کر جائیں، تو عجب

نہیں کہ ہماری طاقت کم ہونے کے بجائے بڑھنا شروع کر دے۔ وسعت کے اسی راز کو پانے کے لیے انسان کیا کچھ پیچ و تاب نہیں کھاتا؟ سمٹنے میں طاقت ہے، یہ تو بڑی عام اور سطحی سی بات ہوئی۔ ہم سب جگہ بھی ہوں اور اپنی جگہ بھی قائم رہیں، ایسا کیوں ممکن نہیں؟ ہم پھیل کر ایک عظیم طاقت کیوں نہیں بن جاتے۔ ایک ہی فضا کے لیے وقف ہو کر کیوں رہ جائیں؟ دوسری فضائیں ہماری قسمت میں کیوں نہ ہوں؟ ہرجائی کی رُوح بھی کچھ ایسے ہی سوالات کا جواب دینے کی کوشش میں در در کی خاک چھانا کرتی ہے۔

ہم ہرجائی کو اچھے لفظوں سے یاد نہیں کرتے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہرجائی کی پیاس اسے اپنا ہی خون پینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ حسن کی طلب گناہ نہیں، لیکن اسی طلب کے زیرِ اثر انسان بڑے سے بڑا گناہ کر بیٹھتا ہے۔ لوگ خواہشات کی تسکین چاہتے ہیں، ان کو سمجھنا نہیں چاہتے۔ تسکین اور سمجھ کے درمیان کی خلیج کو کیسے پُر کیا جائے؟ گمراہی خواہشات کا مقدر ہی بن گئی ہے، ورنہ ہر خواہش کا آغاز انتہائے خلوص سے ہوتا ہے۔ انسان ساری کائنات کے حسن کو اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہے۔ اس کی اس تمنا میں کس قدر زندہ دلی اور فراخ حوصلگی پائی جاتی ہے۔ سب کو حاصل کرنے کی آرزو میں جب انسان کسی کو حاصل نہ کر سکے، تو پھر مارا جاتا ہے۔ اس کی اس موت پر لوگ آنکھ سے آنسو نہیں بہاتے، مُنھ سے جھاگ نکالتے ہیں۔ "بڑے بلند ارادے لے کر اُٹھا تھا، دو قدم بھی نہ چل سکا۔" آغاز کی صداقت کو کوئی نہیں دیکھتا۔ انجام پر آ کر سب کی نظریں جم جاتی ہیں۔

کائنات کا ذرّہ ذرّہ توجہ کا مستحق ہے۔ دیکھنا نیکی ہے۔ دیکھ کر نہ دیکھنا بدی۔ قطعی نہ دیکھنا نہ نیکی ہے، نہ بدی۔ جو آدمی بالکل نہیں دیکھتا، سیدھا دوزخ میں جاتا ہے۔ بدی کرنے والے سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کبھی نیکی بھی کر لے گا، لیکن جو نیکی کرے نہ

نہ بدی، اس سے کوئی اُمید وابستہ نہیں کی جاسکتی۔ ہرجائی کم از کم سیدھا دوزخ میں نہیں جاتا۔ وہ دیکھنے والوں کے زُمرہ میں نہ سہی، دیکھ کر نہ دیکھنے والوں کے زُمرہ میں ضرور شامل رہتا ہے۔ ویسے دیکھ کر نہ دیکھنا ہرجائی کی آن کے خلاف ہے۔ یہیں آ کر وہ بدنام بھی ہوتا ہے دیکھ کر نہ دیکھنے والوں پر کبوتر کی مثال صادق آتی ہے۔ اپنی حفاظت کی حد سے زیادہ فکر اسی طرح قوائے عمل کو شل کر کے ہلاکت کا باعث بن جاتی ہے۔ آنکھیں کھولنا شجاعت ہے، کھول کر بند کر لینا سخت بزدلی۔ اور بزدلی کا نتیجہ ہمیشہ موت رہا ہے۔

لوگوں کو یہ بات ذرا پسند نہیں کہ ہم ہر چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ کوشش ایک طرف رہی وہ ہماری اس قسم کی آرزو تک کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ انسان دن بھر میں خود ہزاروں فضول باتیں کر جاتا ہے، لیکن دوسروں سے ایک فضول بات بھی سننا گوارا نہیں کرتا۔ ہر ایک چیز کو حاصل کرنے کی آرزو بھی تو ایک فضول اور بے معنی سی بات ہے۔ فضول اور بے معنی اس لیے کہ ہم اپنی اس مختصر سی زندگی میں سب کچھ کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے، تو پھر ہمارے دل میں سب کچھ حاصل کرنے کی امنگ کیوں پیدا ہوتی ہے؟ کائنات کا ذرّہ ذرّہ ہمیں اپنی طرف کیوں متوجّہ کرتا ہے؟ ہم کسی ایک چیز کو لے کر کیوں مطمئن نہیں ہو جاتے؟ بقول شخصے ہمارا ذہن اِدھر اُدھر کیوں بھٹکتا رہتا ہے؟

بھٹکنے والا مسافر کسی منزل پر پہنچتا ہو، یا نہ پہنچتا ہو، اس کے مذاقِ سفر میں وسعت ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں بھٹکتا وہی ہے، جس میں قدم اُٹھانے کی طاقت ہوتی ہے۔ ہرجائی اگر اپنی وسعت اور طاقت کو سنبھالنے میں کامیاب ہو جائے، تو شاید دنیا میں اس کردار سے بلند کوئی کردار ثابت نہ ہو سکے۔

ہرجائی کے کردار کی توانائی، وسعت اور ہمہ گیری تسلیم، لیکن اس حقیقت سے بھی

انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کائنات کے ایک بنیادی اصول کو اکثر نظر انداز کر جاتا ہے، یعنی جزو کو کل سے علیحدہ خیال کر بیٹھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری کائنات کے بجائے اجزائے کائنات الگ الگ اس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرانے لگتے ہیں۔ وہ ہر جزو کو ایک منتہٰی سمجھ کر اس کی جانب قدم بڑھاتا ہے اور جب اسے وہ جزو کسی منزل پر پہنچاتا نظر نہیں آتا، تب وہ دوسرے اجزا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اگر اسے اس حقیقت کا علم ہو جائے کہ ہر جزو اپنی ذات میں کل سے علیحدہ کوئی معنی نہیں رکھتا اور جزو میں کل کے جلوے دکھانے کی صلاحیت بھی موجود ہے، تو پھر اس کے ذہن کو اس طرح بھٹکنے کی ضرورت پیش نہ آئے، لیکن جزو میں کل کا مشاہدہ کرنا سخت جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس کے لیے لامحدود کو محدود کر کے دیکھنا پڑتا ہے اور پھر مزید یہ کہ سب سے پہلے حدود کا یہ بھاری طوق اپنے گلے ہی میں ڈالنا ہوتا ہے۔ نہ جانے کتنے قید و بند کاٹنے کے بعد انسان کو لامحدود کی ہلکی سی جھلک نصیب ہوتی ہے۔

وفا کا مطالبہ، کائنات کا سب سے بڑا مطالبہ ہے۔ اس کی ہر چیز وفا کی طالب ہے۔ ہر چیز کی خواہش ہے کہ اسے اپنا بنایا جائے، اس سے محبت کی جائے۔ اس کو اپنی ذات کا ایک جزو خیال کیا جائے۔ اس کو اپنے رگ و پے میں رچایا اور بسایا جائے۔ لیکن وفا کا تعلق (جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے) اندھے پن سے نہیں ہے۔ عرفان و آگہی کے بغیر وفا کی راہ میں ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکتا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اہلِ وفا عقل سے زیادہ وجدان سے کام لیتے ہیں۔ وہ سوچ میں پڑنے کے بجائے سوچ کے سمندر کو پار کرنے کے زیادہ قائل ہوتے ہیں۔ ہرجائی ہو کر بھی انسان کائنات کے اسی مطالبۂ وفا کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو ہرجائی ہونے اور وفادار ہونے میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں رہتا۔ اپنی دانست میں ایک ہرجائی بھی وفا کے راستوں پر قدم رکھتا ہے وفا

کی کٹھن منزلوں کو آباد کرنے کی خواہش اس کے دل میں بھی شدّت سے کروٹیں لیتی ہے۔
کون و مکاں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کی آرزو عین فطرت کے مطابق ہے۔
لیکن اس کے لیے سب سے پہلے ہمیں اپنی ذات کو سمیٹنا ہوتا ہے۔ حصولِ کائنات کا انحصار حصولِ ذات پر ہے۔ جس نے اپنے آپ کو حاصل کر لیا، اس کی دسترس سے دُنیا کی کوئی چیز باہر نہیں۔
ہر جائی ہونے میں آفاق کی وحدت کے پارہ پارہ ہو جانے سے زیادہ انسان کی اپنی ہستی کے پاش پاش ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے اور یہی اس مسئلہ کا نازک ترین پہلو ہے۔
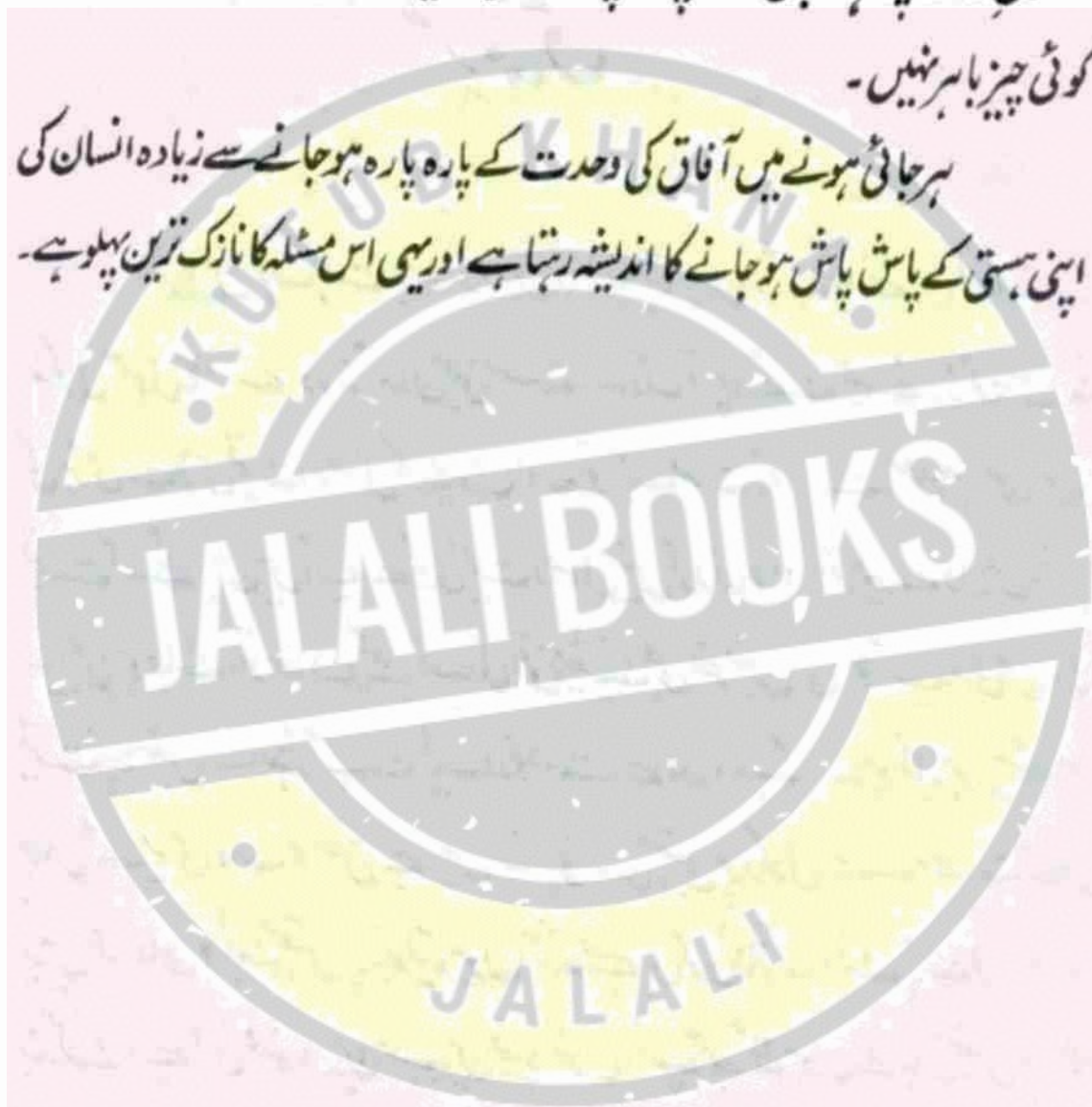
عمرِ طبیعی

آج میں ایک بہت بڑا راز فاش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں افشائے راز نہ کوئی معمولی کام ہے اور نہ آسان یعنی سستا — لوگ تو چھوٹے سے چھوٹے راز کو فاش کرنے کی بڑی سے بڑی قیمت وصول کر لیتے ہیں اور یہ تو ایک بہت بڑا راز ہے، معلوم نہیں اس کی قیمت کیا لگے، لیکن میں آپ سے کوئی قیمت وصول نہیں کروں گا اور اگر میرے دل میں یہ خواہش پیدا بھی ہو جائے، تو معاف کیجیے آپ کی اتنی حیثیت بھی نظر نہیں آتی، جو آپ میری من مانی قیمت چکا سکیں — البتہ آپ سے ایک درخواست ہے اور وہ یہ کہ آپ ہوشیار ہو کر بیٹھ جائیں جہاں تک میری ذات کا تعلّق ہے، میں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لی ہے — خطرات کے موقع پر میں اکثر جان کا نگینہ ہتھیلی پر رکھ لیتا ہوں، تاکہ جیسے ہی کوئی نازک وقت پڑے فوراً مٹھی بند بند کر کے اِسے اپنی محفوظ ترین جیب میں چھپا سکوں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے جان ہتھیلی پر رکھنے کا مفہوم میرے ہاں یہ ہے کہ دوسروں کو خطرے میں ڈال دو اور خود صاف بچ کر نکل جاؤ۔ بہرحال میں نے تو جان ہتھیلی پر رکھ لی ہے، آپ ہشیار ہو کر نہ بیٹھے اور یوں خدانخواستہ آپ کو کوئی نقصان پہنچ گیا، تو میں اُس کا ذمّہ دار نہیں۔

ہو سکتا ہے آپ میری اِس تنبیہہ کا جواب نہایت اطمینان کے ساتھ یہ دیں کہ

"صاحب! ہم آپ سے نہیں ڈرتے ــــ آپ ایک لکھنے والے ہیں ــــ اور لکھنے والے کے پاس کبھی کوئی راز نہیں رہتا۔ اُس کے پاس کوئی راز رہ بھی کیسے سکتا ہے؟ لکھنے والے سے بڑھ کر ہلکے پیٹ کی مخلوق آج تک پیدا نہیں ہوئی ــــ البتہ لکھنے والا خواب ضرور دیکھتا ہے اور خوابوں سے ڈرنا چہ معنی دارد؟ ــــ یہ ایک بچگانہ فعل ہے یا بُزدلی کا مُظاہرہ، ــــ میں آپ کے اِس اعتراض کے جواب میں یہ عرض کروں گا کہ خواب دیکھنے اور راز فاش کرنے میں کوئی فرق نہیں۔ یہ ایک ہی فعل کے دو نام ہیں اور اگر اس میں کوئی لطیف سا فرق بھی ہے تو اِس فرق کی لطافت کو ہر کوئی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ یعنی ہر راز، فاش ہونے سے پہلے، خواب کی صورت اختیار کرتا ہے۔ گویا خواب دیکھنا راز فاش کرنے کے لیے کمر باندھنے کے مترادف ہے ــــ اب یہ بالکل الگ مسئلہ ہے کہ بہت سے لوگ تمام عمر کمر باندھنے میں صرف کر دیتے ہیں اور میدان میں نہیں آتے ــــ چنانچہ میری درخواست نمبر ۲ یہ ہے کہ آپ خواب دیکھنے والے کو کبھی حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ میرا مطلب ہے خواب کو محض خواب نہ سمجھیں بلکہ انکشافِ راز کی ابتدائی صورت خیال فرما کر اُس سے حسبِ توفیق فائدہ اُٹھائیں۔

میں آج کونسا عظیم راز فاش کرنے والا ہوں، اِس ضمن میں پہلی بات یہ سُن لیجیے کہ مجھے لوگوں کی عمریں بتانے میں بڑا ملکہ حاصل ہے۔ آپ میں اگر ہمّت ہو تو آپ بلاتکلّف مجھ سے پُوچھ سکتے ہیں کہ آپ اس دُنیا سے کب رُخصت ہوں گے۔ میں آپ کو بالکل صحیح وقت بتاؤں گا۔ دن تاریخ کا تعیّن تو بہت ہی معمولی بات ہے، میں تو یہاں تک بتا سکتا ہوں کہ کتنے بج کر کتنے منٹ اور سیکنڈ پر آپ کی رُوح قبض کی جائے گی، جب آپ انتقال فرما رہے ہوں گے تو اُس وقت آپ کے سامنے کس کمپنی کا کیلنڈر ہوگا، اُس پر کسی ایکٹرس کی تصویر چھپی ہوئی ہوگی، اِس عظیم الشان تقریبِ رحلت پر آپ نے کونسا لباس زیبِ تن کیا ہوگا ــــ

پاجامہ، دھوتی، نیکر، غرارا، فراک، قمیص یا پھر آپ کسی عریاں کلب کے خاص ممبر کی حیثیت سے بالکل برہنہ ہوں گے، آپ کے مُنھ پر ڈاڑھی ہوگی یا نہیں، آپ کی مونچھوں کا انداز کیا ہوگا، آپ نے کونسا غازہ چہرے پر مل رکھا ہوگا؛ غرض میں لوگوں کو اُن کی صحیح عمریں بتانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں، لیکن آج تک ایسا کوئی خُدا کا بندہ دیکھنے میں نہیں آیا، جس نے مجھ سے اپنی موت کا صحیح وقت دریافت کرنے کا ذرا بھی حوصلہ دکھایا ہو ـــ ایک دن میرے ایک دوست آئے کہنے لگے "معلوم ہونا چاہیے میں کل دوپہر اس دُنیا سے رُخصت ہو جاؤں گا"۔ میں نے پوچھا "خیریت ہے؟" بولے "بس دُنیا سے جی اُچاٹ ہوگیا ہے"۔ میں نے اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "مگر یار تم کل نہیں مرو گے"۔

"نہ مرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے کل خودکُشی کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے۔ تُم سے صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ خودکُشی کا بہترین طریقہ کونسا ہو سکتا ہے ـــ ڈوب کر مروں؟ زہر کھاؤں؟ بجلی کے تار پکڑ کر لٹک جاؤں، گلے میں پھندا ڈال کر مرنا تو خودکُشی کا نہایت ہی دقیانوسی طریقہ ہے، کیا خیال ہے کسی دوشیزہ کی موٹر کے نیچے آکر مرنا کیسا رہے گا"۔

"تم مجھ سے اس طرح پوچھ رہے ہو جیسے میں خودکُشی کے فن کا ماہر ہوں۔ بہرحال تُم کل نہیں مرو گے، بلکہ ....."

"ہاں ہاں بتاؤ میں کب مروں گا؟" اُس نے قدرے پریشان ہو کر پوچھا۔

"تم ابھی دو گھنٹے کے بعد مر جاؤ گے"۔ میرا یہ کہنا تھا کہ اُن حضرت کا چہرہ زرد ہوگیا۔ میں نے جب اُنھیں سمجھایا کہ تم ابھی نہیں مرتے، میں نے صرف تم سے مذاق کیا ہے، تو اُن کی جان میں جان آئی اور ہمیشہ کے لیے خودکُشی کا ارادہ ترک کر دیا ـــ اس واقعہ کو بیان کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ خودکُشی سے کسی فرد کی مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ خود کو موت کے

حوالے کردے، بلکہ اِس سے اُس کا مقصد صرف لوگوں کو دھمکی دینا ہے ــــ یہ محض اتفاق ہوتا ہے کہ دھمکی ہی دھمکی میں موت واقعہ ہو جاتی ہے، ورنہ آخر دم تک خودکشی کا اقدام کرنے والا اِس اُمّید میں ہوتا ہے کہ ابھی ابھی کوئی بھاگا ہوا آئے گا اور اُسے خوشامد کرکے موت کے خوفناک چنگل سے بچالے جائے گا۔

ایک فردِ بشر زیادہ سے زیادہ کتنے برس زندہ رہ سکتا ہے؟ ابھی تک یہ ایک راز ہے۔ عام طور پر آدمی کی عمرِ طبعی سو سال کی بتائی جاتی ہے۔ گویا جو شخص سو سال کی عمر سے پہلے مر جائے، اُس کی موت کا سبب قدرت کو قرار نہیں دینا چاہیے، کوئی اور وجہ تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ ویسے آپ جانتے ہیں جستجو کی جائے، تو دُنیا میں سو سال کی عمر سے زیادہ کے لوگ آسانی کے ساتھ دستیاب ہو سکتے ہیں ــــ مطلب یہ ہے کہ سو برس ایک انسان کی زندگی کی آخری حد نہیں ــــ پھر دو سو برس، تین سو برس، چار سو برس، آخر ایک انسان کتنے برس تک زندہ رہ سکتا ہے؟ اُس کی عمرِ طبعی کیا ہے؟ ــــ یہی تو وہ بڑا راز ہے جس کو آج میں فاش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں ــــ ویسے مجھے اُمّید ہے کہ آپ پیڑ گننے کی نسبت آم کھانے کے زیادہ قائل ہوں گے، بلکہ سچ پوچھیے آپ کو صرف آم کھانے کا قائل ہونا چاہیے ــــ جو لوگ پیڑ گننے کے چکّر میں پھنس جاتے ہیں وہ پیڑ ہی گنتے رہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جب میں آپ کو انسان کی عمرِ طبعی کا راز بتا دوں گا، تو آپ مجھ سے یہ کُرید نہیں کریں گے کہ میں نے یہ راز کہاں سے حاصل کیا ہے ــــ اِس ضمن میں کیا کیا پاپڑ بیلے، کیسی کیسی تکلیفیں اُٹھائیں، کِس کِس دَر کی خاک چھانی، کیسے کیسے چلّے کھینچے، کِن کِن بلندیوں اور پستیوں سے میرا گزر ہوا، میری دانست میں آپ کو اِن سوالات سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے اور فرض کیجیے میں آپ کی اِس پوچھ گچھ کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ صاحب! مجھے اِس عظیم

راز کو حاصل کرنے میں اِس طرح کے تکلیف دہ اور صبر آزما تجربات سے قطعی واسطہ نہیں پڑا، تو کیا آپ کے جذبۂ تجسّس کی تسکین ہو جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ پھر بھی چین سے نہ بیٹھیں گے اور مجھے آپ کی تشفّی کے لیے اُلٹے سیدھے جواب گھڑنے میں مصروف ہونا پڑے گا۔ اب یہ بالکل الگ بات ہے کہ انہی اُلٹے سیدھے جوابوں میں میرے مُنہ سے اصل جواب بھی نکل جائے اور آپ کی پھر بھی تشفّی نہ ہو۔ آپ مجھ سے مسلسل سوال کرتے رہیں۔ "بتائیے نا، آپ کو یہ راز کیسے معلوم ہوا؟ بتا بھی دیجیے۔ ایسی بھی کیا بے اعتباری ہے، بھئی قسم لے لیجیے ہم یہ راز کسی کو نہ بتائیں گے،" اور میں آپ کے اِصرار سے تنگ آ کر کہوں اچھا، تو آپ اصل بات پوچھنا ہی چاہتے ہیں، تو سُنیے مجھے یہ عظیم راز اُس وقت معلوم ہوا، جب زندگی میں پہلی بار مجھ پر شدید زکام نے حملہ کیا۔ جیسے جیسے چھینکیں آتی جاتی تھیں یہ راز فاش ہوتا جاتا تھا۔"

"چھینکوں کا عمرِ طبیعی سے کیا تعلق۔ یہ سب مذاق ہے۔"

"چھینکوں کا زکام سے تو تعلق ہے؟" میں پوچھتا ہوں۔

"بالکل ہے"۔ آپ میری تائید کرتے ہیں۔

"بس اِسی طرح زکام کا عمرِ طبیعی سے تعلّق پیدا کیا جا سکتا ہے۔"

"خدارا مذاق نہ کیجیے اصل بات بتائیے۔"

"اصل بات پوچھنا چاہتے ہیں ــــ تو سُنیے ــــ مجھ پر یہ راز اُس وقت آشکارا ہوا جب میں نے زندگی میں پہلی بار گدھے کی سواری کی اور پھر اُس پر سے دھڑام سے گرا۔"

"گدھے کا انسان کی عمرِ طبیعی سے کیا تعلق ہوا۔"

"گدھے کا انسان سے تعلق تو مسلّم ہے نا۔"

"مسلّم"

"پھر انسان کی عمرِ طبعی سے اُس کا تعلّق کیسے نہ ہوگا؟"

"کیسے ہوگا؟"

"گدھا گھاس چرتا ہے؟"

"چرتا ہے۔"

"آدمی بھی گھاس چرتا ہے۔"

"آپ چرتے ہوں گے۔ میں نے کبھی گھاس نہیں چرا۔"

"تکلف سے کام نہ لیجیے، حق بات کہنے سے شرمانے کی کیا ضرورت ہے"

"چلیے مان لیتا ہوں، آدمی بھی گھاس چرتا ہے۔ گدھے کی طرح نباتات سے زندگی حاصل کرتا ہے۔ لیکن گدھا کوڑی پر بھی تو جاتا ہے۔"

"اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔ آپ نے انسانوں کو گدھے کی طرح کوڑی پر سے غذا حاصل کرتے نہیں دیکھا؟"...... اب آپ خاموش کیوں ہو گئے، جواب کیوں نہیں دیتے۔"

"کیا جواب دوں، آپ تو مذاق کرتے کرتے کج بحثی پر بھی اُتر آتے ہیں — آخر آپ بتاتے کیوں نہیں، آپ نے عمرِ طبعی کا راز کہاں سے حاصل کیا ہے؟"

"اسی گدھے والے واقعہ سے"

"وہ کس طرح"

"کیا آپ شاعری کی زبان سمجھتے ہیں؟"

"ہر انسان جس میں ذرا بھی جذبات پائے جاتے ہیں، شاعری کی زبان سمجھتا ہے۔"

"تو پھر سمجھ لیجیے، جب میں گدھے پر سوار ہُوا، تو مجھے یُوں لگا جیسے پوری کائنات

پر سوار ہوں اور جب گدھے پر سے گرا تو یہ عقل آئی کہ اگر ہوش و حواس اور احتیاط سے کام نہ لیا جائے، تو معمولی افتاد بھی دِن میں تارے دکھا سکتی ہے۔"

"لیکن انسان کی عُمرِ طبعی سے اِس کا کیا واسطہ۔ آپ کو مذاق سُوجھ رہا ہے ۔۔۔ صحیح بات بتانے سے گُریز کر رہے ہیں۔"

"یقین کیجیے میں بالکل گریز نہیں کر رہا ہوں۔"

"تو پھر بتاتے کیوں نہیں ؟"

"مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ پوچھنے کے موڈ ہی میں نہیں ہیں۔"

"یہ آپ نے کیسے محسوس کیا۔ میں تو مسلسل سوال کیے جا رہا ہوں۔"

"ضروری نہیں پے درپے سوال کرنا سائل کے خلوص کو ظاہر کرتا ہو۔"

"کوئی مثال دے کر سمجھائیے۔"

"اپنی ہی مثال لے لیجیے ۔۔۔ میں آم کھلانے چاہتا ہوں اور آپ پیڑ گننے پر اصرار کر رہے ہیں۔"

"کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ ہے کہ میں آپ کو انسان کی عمرِ طبعی کا راز بتانا چاہتا ہوں اور آپ وہ راز دریافت کرنے کے بجائے مُجھ سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ میں نے یہ راز کہاں سے حاصل کیا۔ میرے خیال کے مطابق، تو آپ کو انسان کی عمرِ طبعی معلوم کرنے کے لیے بے چین ہو جانا چاہیے تھا۔ آپ مجھ سے فوراً پوچھتے کہ اگر انسان کی عمرِ طبعی سو سال نہیں، تو پھر کتنے سو سال ہے۔ یہ کیا غضب ہے کہ انسان جلدی مر جاتا ہے ۔۔۔ دو سو چار سو سال تو بڑی بات ہے وہ عام طور پر سو سال بھی زندہ نہیں رہتا۔"

"سچ پوچھیے، تو مجھے آپ کی بات پر یقین نہیں آ رہا ہے — یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ انسان کی عمرِ طبیعی کا راز نہیں بتا رہے، بلکہ کوئی اُونچی قسم کی غپ سرکانا چاہتے ہیں۔ ہاں اگر آپ یہ بتا دیں کہ اِس راز کے معلوم کرنے کا سورس (SOURCE) منبع کیا ہے؟ تب شاید آپ کی بات پر یقین بھی آ جائے۔"

"اچھا تو ایک بار پھر سُنیے۔ جب مجھے ابّو نے پہلی مرتبہ ربڑ کا غبارہ لا کر دیا اور جیسے ہی وہ میرے ہاتھ میں آ کر پٹاخ سے بولا، مجھ پر یہ عظیم راز اُس وقت فاش ہوا تھا۔"

"گویا آپ کو یہ معلوم ہوا تھا کہ انسان کی زندگی ربڑ کے غبارے کے مانند ہے، ذرا اُسے زور سے دبایا اور وہ پٹاخ سے ہوئی — معاف کیجیے انسانی زندگی کی اِس سے بہتر تشبیہ تو اِس معمولی سے شعر میں ہے جس میں کہا گیا ہے۔ "آدمی بُلبلہ ہے پانی کا"۔

"خوب تو میری گفتگو سے آپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ میں انسان کی عمرِ طبیعی کو ربڑ کے غبارے یا پانی کے بُلبلے کے برابر سمجھتا ہوں۔

"بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔"

"مجھے تشبیہ اور استعارے کی اہمیّت سے انکار نہیں۔ میں اسے زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کا ایک خوبصورت ذریعہ بھی قرار دے سکتا ہوں، لیکن تشبیہ اور استعارے کے ذریعے انسانی زندگی پر حدیں قائم کرنے کا میں کسی طرح قائل نہیں — انسانی زندگی کو ربڑ کا غبارہ یا پانی کا بلبلہ سمجھنے والے انسانی زندگی کو تو کیا سمجھ پائیں گے، وہ ربڑ کے غبارے اور پانی کے بُلبلے کی حقیقت کو سمجھنے کی تاب بھی نہیں لا سکتے۔"

آپ کے اور میرے درمیان مکالمہ خاصہ طویل ہو گیا ہے، جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ چلیے اِس مکالمے سے اِتنا فائدہ ضرور پہنچا ہو گا کہ ہماری آپس کی کچھ غلط فہمیاں دُور

ہوئی ہوں گی اور کچھ تازہ غلط فہمیوں نے جنم لیا ہو گا ــــ کہتے ہیں پُرانی غلط فہمیوں کا دُور ہونا اور تازہ غلط فہمیوں کا جنم لینا یہ دونوں فعل ہی انسانی رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے ایک نیک شگون کی حیثیت رکھتے ہیں ــ بہرحال میں آپ کو انسان کی عمرِ طبیعی کا راز بتائے دیتا ہوں۔ البتہ اس ضمن میں ایک دو باتیں ذہن نشین کرنا لازمی ہیں ــــ اوّل یہ کہ جب سے دُنیا بنی ہے اور اُس میں انسان کا ظہور ہوا ہے، اُس وقت سے لے کر آج تک کوئی فردِ بشر اپنی موت نہیں مرا۔ لوگ یا تو خودکشی کا شکار ہوئے یا اُنھیں قتل کیا گیا ہے ــــ ویسے آپ مجھ سے اتّفاق کریں گے، میرے نزدیک خودکشی اور قتل میں کوئی فرق نہیں ــ خودکشی اور قتل میں کوئی فرق نہیں ــــ خودکشی بھی قتل ہی کی ایک صورت ہے ــــ غور کرنے کی دوسری بات یہ ہے کہ ممکن ہے آبِ حیات کا قصّہ من گھڑت ہو، لیکن خود آبِ حیات کوئی خیالی چیز نہیں ہے ــــ یہ تو ایک بہت بڑی ٹھوس حقیقت ہے ــــ میں سمجھتا ہوں انسان کی تخلیق کا جزوِ اعظم آبِ حیات ہے۔ اِس پانی سے تو انسان کا خمیر گُندھا ہے۔ لوگ جب آبِ حیات کی جستجو اور تلاش کا ذکر کرتے ہیں تو مجھے ہنسی آتی ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے نیلے آسمان کے نیچے کھڑے ہوئے ہم خورشیدِ جہاں تاب کی موجودگی میں یہ کہیں کہ روشنی کہاں ہے اِسے تلاش کرو ــــ آپ جانتے ہیں زندگی کے لامتناہی امکانات کے تسلسل کا نام آبِ حیات ہے۔

غالباً اب کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ آپ اچھّی طرح سمجھ گئے ہوں گے میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ اب آپ کو یہ دریافت کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہی ہو گی کہ انسان کی عمرِ طبیعی کتنے سال ہے ــــ جو راز میں نے فاش کیا ہے اس کے مطابق تو انسان پیدا ہونے کے بعد کبھی نہیں مرتا ۔ اُس کی عمرِ طبیعی اُس کی ساعتِ ولادت سے لے کر ابد تک پھیلی

ہوئی ہے۔ ابھی تک دنیا میں جس قدر اموات واقع ہوئی ہیں، اُس کی تمام تر وجہ انسانی معاشرے کی خرابی ہے ——ہم خود نہیں مرتے لوگ ہمیں مارتے ہیں۔ انسان کو مِل جُل کر رہنا آجائے، یعنی معاشرہ سنور جائے، تو انسان ابد تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ انسان مرے گا نہیں، تو دنیا کی آبادی اِس قدر بڑھ جائے گی کہ جس کے تصوّر سے بھی خوف آتا ہے، دوسرے ایسی صورت میں بوڑھوں کی تعداد کا بھی کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا تیسرے آدمی مرے گا نہیں، تو بقولِ غالب ہوس کے لیے نشاطِ کار کا سامان کہاں سے مہیّا ہوگا۔ اِن اندیشہ ہائے "کم نگاہی" کے جواب میں یہ عرض ہے کہ دُنیا کی آبادی بڑھتی اس لیے ہے کہ آپ انسانوں کو جینے نہیں دیتے۔ فطرت اِنتقام کے طور پر شرحِ پیدائش میں اضافہ کر دیتی ہے۔ صحیح خاندانی منصوبہ بندی یہ ہے کہ آپ صاف سُتھرا معاشرہ وجود میں لائیں شرحِ پیدائش خود بخود اعتدال پر آجائے گی —— بڑھاپے کے بارے میں یہ عرض ہے کہ انسان بوڑھا معاشرتی خرابیوں کی بنا پر ہوتا ہے (واضح رہے کہ میں لفظِ معاشرہ کو وسیع ترین معنی میں استعمال کر رہا ہوں) اگر معاشرے میں صحت مند اقدار کی کارفرمائی ہو جائے، تو انسان کبھی بوڑھا نہ ہو —— میرے خیال میں انسانی زندگی کے چار نہیں، بلکہ تین درجے ہیں۔ بچپن، لڑکپن اور جوانی —— بڑھاپا فطرت کا عطیّہ نہیں، بلکہ خود انسان کے کرتوت کی سزا ہے —— لہٰذا انسان جب جیو اور جینے دو کے اصول کو اچھی طرح اپنائے گا، تو پھر کبھی بوڑھا نہیں ہوگا ——

غالب کے نشاطِ کار کے بارے میں عاقلاں را اشارہ کافیست کے تحت اتنا کہنا بہت ہے کہ غالب نے نشاطِ کار کا ذکر ہوس کے لیے کیا ہے اور لفظ ہوس اچھے معنی کا حامل نہیں، چنانچہ اعلیٰ انسانی معاشرہ میں ہوس کی صورت بھی بدل جائے گی اور اس کے ساتھ ساتھ نشاطِ کار کا وہ محدود تصوّر بھی باقی نہیں رہے گا جس کا اظہار غالب نے اپنے شعر میں بڑے شدّ و مد سے کیا ہے۔

ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ بات بُری طرح کھٹک رہی ہو کہ اِس کائنات کی ہر شے کے مقدّر میں فنا ہے اور میں انسان کو خواہ مخواہ اس سے مستثنیٰ قرار دے رہا ہوں۔ واضح رہے کہ ہم ابھی تک شے اور انسان کے فرق کو سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ ابھی تک انسان کو ایک شے سمجھا جاتا ہے، حالانکہ انسان، شے اور لاشے کے درمیان کی ایک مضبوط کڑی ہے، جس کی فنا کو بقولِ میرؔ ہم زیادہ سے زیادہ، زندگی کا ایک وقفہ قرار دے سکتے ہیں۔ ویسے جہاں تک میرا سوال ہے، میں نے آپ کو نہ صرف آبِ حیات کے جام پر جام پلائے ہیں، اُس میں بھرپور غسل بھی کرا دیا ہے، آپ کو زندگیٔ جاوداں بھی بخش دی ہے، آپ کو موت کے خوف سے بھی اُونچا اُٹھا لیا ہے — اصولاً تو آپ کو میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے اور اگر آپ مجھے باقاعدہ طور پر سلامی بھی دیں تو میں اسے بخوشی قبول کرنے کو تیار ہوں، لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ دِل ہی دل میں مجھ پر ہنس رہے ہوں۔

آزادی کے درد

ہم عام طور پر اپنی روزمرّہ کی گفتگو میں زندگی اور آلام کی وابستگی کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔غم کو لازمۂ حیات قرار دے کر بزعمِ خود اپنے فرزانہ ہونے کا بہت بڑا ثبوت بھی بہم پہنچاتے ہیں۔ ذرا غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بات بڑی حد تک سطحی ہے۔ دُکھ درد کا تعلق زندگی سے اتنا شدید اور گہرا نہیں ہے جتنا سمجھ لیا گیا ہے۔ ہم محض زندہ رہ کر دُکھوں کے احساس سے پُوری طرح باخبر نہیں رہ سکتے۔ شعورِ درد کے لیے صرف زندگی کافی نہیں، اس کے لیے کچھ اور بھی درکار ہے۔ زندگی کی وسعت اور بیکرانی تسلیم، لیکن انسانی درد و الم جس حوصلہ و جگرداری اور عرفان و آگہی کا تقاضا کرتے ہیں، اس کے پیشِ نظر صرف پھیلاؤ اور بے پایانی کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے۔ اس لیے جب ہم انسان کے آلام و مصائب کی حیثیت متعین کرنے بیٹھتے ہیں، تو ہمیں زندگی سے آگے بڑھ کر سوچنا لازم ہو جاتا ہے ــــ اور زندگی سے آگے بڑھ کر سوچنے کے معنی ہیں آزاد ہو کر سوچنا۔ آدمی جب آزاد ہو کر سوچتا ہے، تو زندگی پر اپنے احکام صادر کرتا ہے۔ اُسے اپنے تصرّف میں لاتا ہے۔ اس کی ناپختگی کو دُور کرتا ہے۔ اگر آدمی آزاد ہو کر نہ سوچے، تو زندگی کی حیثیت خام مال کی سی رہ جاتی ہے۔ زندگی پر حکم لگانا، اُسے اپنے تصرّف میں لانا، آزاد ہو کر سوچنا آسان نہیں۔ فکر کی آزادی جو درحقیقت

اصل آزادی ہے، انسان کو زندگی کے آلام و مصائب سے حقیقی معنوں میں دوچار کرتی ہے، اسی لیے یہاں یہ کہنا بے جا نہیں کہ دُکھ درد کا تعلق زندگی سے اتنا شدید نہیں ہے جتنا آزادی سے ہے۔ غموں کو برداشت کرنا آسان ہے، ان کو سمجھنا مشکل۔ جس طرح ایک لادو جانور آسانی سے اپنے آپ پر کتابیں لدوا لیتا ہے اور اُسے ان کے سمجھنے کی کبھی توفیق نہیں ہوتی، اسی طرح عموماً لوگ غموں کو اپنے آپ پر لاد تو لیتے ہیں، لیکن انھیں یہ سمجھنے کی سعادت کبھی نصیب نہیں ہوتی کہ ان غموں میں کیا کیا بصیرتیں اور توانائیاں موجود ہیں۔ زندگی آدمی کو غم زدہ کرتی ہے اور آزادی غم آشنا۔ بالفاظِ دیگر زندگی درد بخشتی ہے اور آزادی ہمیں دردمندی کی دولتِ بیدار سے مالا مال کرتی ہے۔

اگست ۴۷ء میں ہم آزاد ہوئے تھے۔ اِس عرصے میں ہم نے زندگی کے مختلف شعبوں میں کچھ نہ کچھ کیا بھی۔ ہم ہر سال یومِ آزادی بھی مناتے رہے۔ اس مدّت میں ہم نے اپنے آپ کو یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی کہ ہم آزاد ہو گئے ہیں، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمارے ایک رویّے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور ہمارا وہ رویّہ یہ ہے کہ ہم نے ایک آزاد قوم کے افراد کی طرح اپنے مصائب اور مشکلات سے کام لینا نہیں سیکھا۔ بے شک ہم روتے ہیں، کراہتے ہیں اور شور بھی مچاتے ہیں، لیکن ہم نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ خالی رونے اور آنسو بہانے سے کچھ نہیں بنتا۔ اس صورتِ حال کا ایک عبرت ناک پہلو یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح اپنے دکھوں کا رونا روتے ہیں، حقیقی معنوں میں درد کا رشتہ ان کے دلوں سے ٹوٹ چکا ہوتا ہے۔ ہم آئے دن اپنی خامیوں، کوتاہیوں اور خرابیوں کا ذکر تو کرتے رہتے ہیں، لیکن ان کو دُور کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ کیوں؟ اس کا جواب جیسا کہ عام طور پر دیا جاتا ہے، یہ نہیں ہے کہ ہمیں اپنی خرابیاں نظر نہیں آتیں، یا ہم ان سے بے خبر ہیں۔ ہم اپنی کوتاہیوں کو

اچھی طرح جانتے ہیں، لیکن ان کو دُور کرنے کی اس لیے سعی نہیں کرتے کہ ہمیں ان سے جیسی تکلیف اور دُکھ پہنچنا چاہیے، وہ نہیں پہنچتا۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری خرابیوں کی اطلاع ہمارے کانوں تک آکر رُک جاتی ہے، دلوں تک نہیں پہنچنے پاتی۔ ہماری خبر، ہمارا علم، احساس کے سانچے میں ڈھلنے سے محروم رہتا ہے اور یوں ہم دکھوں کے عین نرغے میں گھر جانے کے باوجود دُکھوں سے ناآشنا ہیں۔

آزادی حاصل ہوتے ہی گوناگوں مسائل کا پیش آنا ایک قدرتی بات تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم اپنے مسائل کو حل کرتے، لیکن حل کرنے کے بجائے ہم نے ان کو پرورش کرنا شروع کر دیا۔ آپ اس حقیقت سے تو بخوبی واقف ہوں گے کہ مسائل کو حل کرنے کا پہلا اور بنیادی اصول یہ ہے کہ ان کو محض مسائل نہ رہنے دیا جائے، بلکہ اپنا دُکھ اور درد بنا کر محسوس کیا جائے۔ کسی قوم کے مسائل جب تک اس کے افراد کا دُکھ نہیں بن جاتے، ان کے حل کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوا کرتی۔ ہم نے اپنے ساتھ سب سے بڑی زیادتی یہی کی کہ اپنے مسائل کو محض مسائل سمجھا۔ اس کے نتیجے کے طور پر یہ ہوا کہ ہم خیالی گھوڑے دوڑانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکے۔ مسائل کو حل کرنے اور ان کی پرورش کرنے میں یہی فرق ہے کہ جب مسائل کو حل کیا جاتا ہے، تو وہ دُکھ کی طرح محسوس ہوتے ہیں اور جب ان کی پرورش مقصود ہوتی ہے، تو ان پر گفتگوئیں کی جاتی ہیں۔ ہم اپنے مسائل کو دُکھ کی طرح محسوس نہیں کرتے، فقط ان کا ذکر کر کے کُڑھ لینے کو کافی سمجھتے ہیں ـــــ اس بات کو ہماری روزمرّہ کی زندگی کے کسی پہلو سے بھی بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر رشوت کے مسئلے کو لیجیے۔ جب ہم سے کوئی متعلقہ آدمی رشوت مانگتا ہے، تو ہمیں یقیناً اس کی اِس بات پر غُصّہ آتا ہے اور تکلیف ہوتی ہے۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم رشوت مانگنے والے کو رشوت نہ دیں اور اپنی تکلیف کو برقرار رکھیں

تاکہ رشوت کا مسئلہ ہمارے لیے دُکھ بن سکے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ کچھ دیر کے لیے اُس آدمی پر غُصّہ دکھا کر ہم اُسے رشوت دے ڈالتے ہیں یا سفارش سے اپنا کام نکالتے ہیں اور پھر بعد میں اپنی اس حرکت کے جواز میں طرح طرح کی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایسا کرنے سے ہماری وقتی تکلیف رفع ہو جاتی ہے اور ممکن ہے ہمارا کوئی حق بھی مرتا مرتا بچ جاتا ہو، لیکن ہمارے اس رویّے سے رشوت کا مسئلہ یقیناً ہمارے دُکھ کا حصّہ نہیں بن جاتا۔ یہی کچھ سلوک ہم دوسرے مسائل کے ساتھ روا رکھتے ہیں، دراصل ہمارے ساتھ ہو یہ رہا ہے کہ ہمیں کوئی مسئلہ تنگ نہیں کرتا اور ظاہر ہے کہ جب مسائل تنگ نہ کریں، تو پھر وہ حل نہیں ہوا کرتے۔ البتّہ انھیں تھپک کر ضرور سُلایا جا سکتا ہے، چنانچہ ہم لوگ مسائل کو حل کرنے کے بجائے انھیں تھپک کر سُلانے کے زیادہ عادی ہو گئے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے دلوں سے درد کا رشتہ قائم کریں۔ دُکھوں سے بچنے کے بجائے ان سے مقابلہ کرنے کی عادت ڈالیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے چاروں طرف تکالیف کے انبار لگے پڑے ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم دُکھی نہیں ہیں۔ دُکھ درد کو ہم نے اپنے دلوں میں نہیں اُتارا۔ ہم انھیں اپنی ذات سے الگ کوئی شئے سمجھتے ہیں۔ کیا درد سے ہماری یہ بیگانگی ہمیں آزادی کے سچّے احساس سے بیگانہ نہیں کیے ہوئے ہے؟ اور کیا یوں ہم زندگی سے بُری طرح کٹ کر نہیں رہ گئے ہیں؟

ہوس

پہلی چیز جو انسان کے دل کو واقعی کھٹکھٹاتی ہے اور اُس پر مکمل اعتماد کے ساتھ دستک دیتی ہے وہ ہوس ہے۔ اگر انسان شروع ہی میں اِس دستک پر آنکھیں کھول کر اُٹھ بیٹھے، تو پھر عمر بھر طرح طرح کے رنجگوں اور بیداریوں سے فیض یاب ہوتا رہتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو (جیسا کہ عموماً نہیں ہوتا) تو پھر ہمیشہ کے لیے ہوس کے چکر میں پھنس جاتا ہے۔

ہوس کی ابتدائی آوازیں صورِ اسرافیل سے کم نہیں ہوتیں۔ کانوں تک پہنچ جائیں، تو مُردے زندہ ہو کر قبروں سے نکل آتے ہیں ـــــ ہوس کی آواز صورِ اسرافیل کی آواز سے اِس لیے مشابہت رکھتی ہے کہ یہ جلاتی بھی ہے اور مارتی بھی ـــــ فرق صرف یہ ہے کہ صورِ اسرافیل پہلے موت کی نیند سُلائے گا اور بعد میں زندہ کرے گا ـــــ اور ـــــ ہوس پہلے زندہ کرتی ہے اور پھر موت کی نیند سُلاتی ہے۔

سُنہری موقعہ

"ہر انسان کی زندگی میں کم از کم ایک بار ایسا سُنہری موقعہ ضرور آتا ہے جس سے اگر وہ فائدہ اُٹھالے، تو اپنی زندگی کو کامیاب و کامران بنا سکتا ہے۔" آپ نے اس قسم کا جملہ اکثر لوگوں کو کہتے سُنا ہوگا اور ممکن ہے آپ اس کے قائل بھی ہوگئے ہوں، کیونکہ جب ہر انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی سُنہری موقع ضرور آتا ہے، تو آپ کی زندگی اس سے کس طرح محروم رہ سکتی ہے؟ لیکن یقین کیجیے مجھے اپنی زندگی میں کبھی کسی سُنہری موقع کی صورت دیکھنا نصیب نہیں ہوئی۔ لوگوں سے بار بار یہ سُنتے ہوئے کہ "زندگی میں سُنہری موقع ضرور آتا ہے"۔ میں کئی دفعہ ٹھنڈے اور گرم دل کے ساتھ یہ غور کرنے بیٹھا ہوں کہ واقعی کہیں یہ بات سچ ہی نہ ہو اور میری زندگی میں کبھی کوئی ایسا موقع آیا ہو جسے میں اگر اپنی غفلت کی بھینٹ نہ چڑھا دیتا، تو نہ جانے آج میری زندگی کن کن بلندیوں کو چھو چکی ہوتی، لیکن صاحب! مسلسل غور و خوض کے باوجود مجھے اپنی گزشتہ زندگی میں کوئی ایسی چمکدار چیز نظر نہ آئی جسے میں موقع کے خوش آہنگ نام سے یاد کر سکتا۔

سوچتا ہوں کہ جب ہر انسان کی زندگی میں کم از کم ایک بار سُنہری موقع ضرور آتا ہے، تو میری زندگی اس سعادت سے کیوں محروم رہ گئی؟ بات دراصل یہ ہے کہ اول تو سرے سے یہ مفروضہ ہی غلط ہے اور اگر ہم اس کے درست ہونے کا کوئی جواز نکال بھی لیں، تو ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ اسے

سمجھنے میں عموماً لوگ غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں زندگی کا ہر لمحہ ایک سنہری موقع ہے۔ انسان اپنی زندگی کو کامرانیوں سے مالا مال کرنے کے لیے جس وقت بھی چاہے عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ زندگی میں سُنہری موقعے خود بخود پیدا نہیں ہوتے بلکہ انھیں پیدا کیا جاتا ہے۔

یہ درست ہے کہ بعض لوگوں کی زندگیوں میں کچھ ایسے اتّفاقات رُونما ہو جاتے ہیں جن سے اگر وہ فائدہ اُٹھا لیتے ہیں، تو ان کی زندگیاں جگمگا اُٹھتی ہیں اور اگر وہ ان سے غفلت برت جائیں، تو بہت بڑے نقصان میں رہ جاتے ہیں لیکن ایسے اتّفاقات کا معرضِ وجود میں آنا بہت شاذ ہوتا ہے۔ اِن اتّفاقات کے لیے ضروری نہیں کہ یہ ہر انسان کی زندگی میں لازمی طور پر رُونما ہوں، اتّفاقات کا تعلق نہ انسان کی تقدیر سے ہے اور نہ ہی اس کی تدبیر سے۔ یہ تو ایک جُداگانہ حیثیت رکھتے ہیں، لیکن اگر ہم ذرا غور سے کام لیں، تو ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ان کی یہ جُداگانہ حیثیّت بھی اپنے دامن میں کوئی بڑی عظمت اور وجاہت نہیں رکھتی۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کو محض اتّفاقات کے سہارے چھوڑ دینے سے ہمارا ایک دن بھی خوبی کے ساتھ نہیں گزر سکتا۔ بہرحال یہ جو کہا جاتا ہے کہ زندگی میں موقعے بار بار نہیں آتے۔ اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے قدرت نے انسان کو اس کی مُدّتِ عمر میں صرف ایک دو ساعتیں ہی مرحمت فرمائی ہیں۔ اگر وہ ان ساعتوں کو غفلت میں گزار دیتا ہے، تو پھر زندگی بھر اس کے لیے ترقی کرنے کا کوئی امکان نہیں رہ جاتا، ”مواقع بار بار نہیں آتے“ یا ”گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں“ کہنے سے دراصل ہمارے بزرگوں کا یہ مطلب تھا کہ ہم غفلت کی نیند نہ سو جائیں اور ہم میں یہ احساس باقی رہے کہ ہماری زندگی کا عرصہ بہت تھوڑا ہے، اس کی ہر ساعت سے ہمیں فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ ہمارے اسلاف کا مطلب تھا تو کچھ اور لیکن ہم نے اسے سمجھ لیا کچھ اور ـــــ وہ تو یہ

چاہتے تھے کہ ہم دُنیا کے لہو و لعب میں اس قدر نہ کھو جائیں کہ ہمیں زندگی کی قدر و قیمت کا احساس ہی باقی نہ رہے، لیکن ہم نے بزرگوں کی اس تنبیہہ کے معنی ہی بدل ڈالے یعنی ہم نے ان کے کہنے سے کہ "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" یہ سمجھ لیا کہ ہماری زندگی کا جو وقت گزر چکا ہے دراصل وہی ہماری زندگی کا حاصل تھا۔ لہٰذا اب ہمارے سامنے کامیابی اور ترقّی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ یا پھر زندگی میں کم از کم ایک بار سنہری موقعہ ضرور آتا ہے، سے ہم نے یہ مفہوم اخذ کیا کہ زندگی کو کامیاب بنانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس سنہری موقعہ کا انتظار کیا جائے جسے ضرور آنا ہے دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہوئے کہ موقعہ آئے گا تو زندگی کو بنا سنوار لیں گے، ورنہ تمام عمر اس کے انتظار میں گزر جائے گی۔ بہت سے لوگ اپنی زندگیاں اس بات پر کفِ افسوس ملتے گزار دیتے ہیں کہ فلاں فلاں موقعے زندگی میں آئے، لیکن ان سے فائدہ نہ اُٹھایا گیا۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جو موقعے ہمیں اپنی گزشتہ زندگی میں سُنہری معلوم ہوتے ہیں وہ اتنے سُنہری نہیں ہوتے، جتنا کہ ہمارا ذہن ان پر ملمع چڑھا دیتا ہے۔ موقعوں کا فلسفہ سمجھنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان زمانہ کی تقسیم کو بھول جائے یعنی وقت کو ماضی، حال اور مستقبل کی حد بندیوں سے اُونچا اُٹھا کر دیکھے۔ زندگی نہ ماضی ہے اور نہ مستقبل وہ تو جاوِداں اور ہمہ دواں ہے، جسے ہم اور آپ زمانہ حال کہتے ہیں۔ ہم اس وقت جن لمحوں سے صحیح معنوں میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں، وہ نہ تو گزرے ہوئے لمحے ہیں اور نہ آنے والے بلکہ وہ قیمتی لمحے، تو یہی ہیں جن کی آغوش میں اس وقت ہماری زندگی جھولا جھول رہی ہے۔ حال کا ہر لمحہ ہمارے لیے سُنہری موقع فراہم کر سکتا ہے، بلکہ اگر ہم پوری شدت کے ساتھ محسوس کریں، تو ہمیں حال کا ہر لمحہ ایک سُنہری موقع نظر آئے۔ گزرے ہوئے زمانہ کی یادیں اور آنے والے زمانہ کے خواب ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، اگر ہم میں زمانۂ حال کی قدر و قیمت کا صحیح

اندازہ لگانے کی صلاحیت نہیں ہے۔

زمانۂ حال کی قدر و قیمت کا احساس ہی ہمارے لیے سنہری موقعوں کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے۔ ذرا غور تو فرمائیے عام طور پر موقع سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے؛ یہی نا کہ ایسا وقت جب ہم اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے یقین کے ساتھ کوئی قدم اُٹھا سکیں؛ چنانچہ زندگی میں انسان ہر وقت اپنی آرزوؤں اور تمنّاؤں کو بر لانے کے لیے جدّوجُہد کر سکتا ہے، لیکن اس سے میری مراد یہ نہیں کہ جب ہمیں یہ علم ہو گیا کہ زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے کسی وقت بھی قدم اُٹھایا جا سکتا ہے، تو اس یقین کی بدولت ہم بے فکری کی نیند سو جائیں اور کبھی قدم نہ اُٹھائیں۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ گزرے ہوئے زمانہ کی یاد میں وقت ضائع نہ کیا جائے اور نہ ہی مستقبل کے سُنہری خوابوں میں انسان خود کو گُم کر دے، بلکہ صحیح راستہ یہ ہے کہ زمانۂ حال سے پُوری طرح فائدہ اُٹھایا جائے۔ حال سے انسان اسی وقت مکمل طور پر مستفید ہو سکتا ہے جب اسے یہ یقین ہو جائے کہ یہی وقت ہے جس میں وہ اپنی زندگی کو خواہشات کے مطابق کمال تک پہنچا سکتا ہے۔ زمانۂ حال کی اہمیّت کا شدید احساس ہمارے لیے کامیابیوں کے بے شمار راستے کھول سکتا ہے۔

مواقع سے متعلق ایک اور پُرلطف بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ یوں تو زندگی کا ہر لمحہ ایک سُنہری موقع ہے، لیکن موقع کا سُنہری یا نقرئی ہونا ہر انسان کی اپنی ہمّت اور صلابتِ شوق پر منحصر ہے۔ ایک موقع ایک آدمی کے لیے سُنہری ہو سکتا ہے، وہی موقع دوسرے آدمی کے لیے بالکل معمولی اور غیر اہم؛ چنانچہ ایک آدمی جس قدر زیادہ باہمّت اور حوصلہ مند ہو گا، اسی قدر اس کی زندگی میں سُنہری مواقع پیدا ہوتے رہیں گے۔ آدمی میں مشکلات کو حل کرنے کی جتنی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، اُتنی زیادہ اس کی زندگی زرّیں

مواقع سے جگمگاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن افراد میں حالات سے مقابلہ کرنے کی جرأت ہوتی ہے، وہ موقعوں کا انتظار نہیں کرتے، بلکہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں اور اِس طرح اُن کی زندگی کا ہر لمحہ ایک سُنہری موقع بنتا چلا جاتا ہے۔

اطمینان

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ زندگی میں انسان کو کبھی مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔ اطمینان انسان کی ارتقائی صلاحیتوں کو مفلوج کر ڈالتا ہے۔ جیسے اطمینان حاصل ہو جاتا ہے وہ زندگی میں کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ جب تک آدمی بے اطمینان رہتا ہے، اُس کے دل میں کچھ کر گزرنے کی لگن قائم رہتی۔ جہاں اس کو اطمینان حاصل ہوا اسکی یہ لگن بھی جاتی رہی۔ گویا ان صاحبان کی نظر میں اطمینان ہوا کا ایک ایسا نامراد جھونکا ہے، جس کے آتے ہی قلبِ انسانی میں شوق و آرزو کی جگمگاتی ہوئی شمعیں یکایک گُل ہو جاتی ہیں۔

اطمینان کے اگر یہی معنی ہیں کہ انسان اپنی موجودہ صورتِ حال کو ماحصلِ حیات سمجھ بیٹھے اور آئندہ ترقی کا خیال چھوڑ دے، پھر تو یقیناً اطمینان کوئی قابلِ قدر چیز نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ہم ایک انسان سے اعلیٰ توقعات وابستہ نہیں رکھ سکتے۔ ایسا انسان زندگی میں کوئی اہم کام سرانجام دینے کے قابل نہیں رہتا۔ ذہنِ انسانی کی یہ کیفیت اس کی بے شمار عُمدہ صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دیتی ہے، سکون و جمود کی اس حالت میں ہم ایک شخص سے زیادہ سے زیادہ یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے دوسرے ہم جنسوں یعنی انسانوں کو تنگ نہیں کرے گا اور خاموشی کے ساتھ پالتو چوپایہ جانوروں کی طرح زندگی گزار دے گا۔ اس قسم

کا اطمینان انسان کو ایک خاص سطح سے اُونچا نہیں اُٹھنے دیتا۔ اس کا زاویۂ نگاہ محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور وہ زندگی کے بارے میں کسی بلند نظریہ کا حامل نہیں رہتا۔ ذہنِ انسانی کی یہ سطح حیوانیت سے کچھ ہی بلند کہی جا سکتی ہے۔ ورنہ انسان اور حیوان میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ عام طور پر دوسرے جاندار ہر حال میں مگن رہتے ہیں اور انسان کسی حال میں بھی صحیح معنوں میں مگن نہیں رہتا۔ دراصل اگر انسان کی فطرت میں اس طرح مگن ہونے کی صلاحیت پائی جاتی، تو پھر دنیا اس قدر ترقی یافتہ نظر نہ آتی، جیسی کہ ہم آج دیکھ رہے ہیں۔

خوب سے خوب تر کی جستجو کا جذبہ ہی انسان کو بے چین رکھتا ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کی یہ بے چینی صحیح نہیں ہے؟ اور اگر یہ صحیح ہے تو پھر اطمینان کسے کہتے ہیں؟ اور اگر اطمینان کے معنی سکون و آرام کے ہیں تو کیا یہ معنی درست ہیں؟ کیا وہ لوگ حق بجانب نہیں ہیں جو اطمینان کو ارتقاء کے راستے میں ایک مستقل دیوار سمجھتے ہیں؟ بات دراصل یہ ہے کہ اطمینان کے معنی اس تمام مفہوم سے علٰحدہ ہیں، ہم اسے نہ سکون سے تعبیر کر سکتے ہیں اور نہ ہی اضطراب سے۔

ذرا واضح الفاظ میں اِسے یوں سمجھ لیجیے کہ اطمینان، انسان کی اُس ذہنی کیفیت کا نام ہے جس کے حصول کے بعد وہ زندگی کے ہر سرد و گرم سے مردانہ وار گزر جاتا ہے۔ اس کی اس کیفیت میں بے قراری بھی ہوتی ہے اور قرار بھی۔ ایک مطمئن انسان بے قرار اس لیے ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی ہر خوبی کو اپنے میں جذب کرنے کی آرزو رکھتا ہے اور پھر اس کی یہ آرزو اُسے محض خیالی انسان ہی نہیں رہنے دیتی بلکہ مُسلسل سعی و عمل کے لیے اُکساتی رہتی ہے جس انسان کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے وہ عمل کی راہ میں زیادہ مستقل مزاجی اور پُر وقار طریقے سے قدم اُٹھاتا ہے۔ اس کی سرگرمیاں زیادہ یقین اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اطمینان

جہاں آدمی کو خوب تر کی جستجو کے لیے بے چین رکھتا ہے، وہاں اس کے ہوش و حواس بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ایک مطمئن انسان کی بے چینی میں ہنگامۂ طلب تو ہوتا ہے، لیکن گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ اس کی بے چینی عقل و خرد کو ماند کرنے کے بجائے مزید جِلا بخشنے کا موجب ہوتی ہے۔ ایسے انسان کے لیے حال کی سازگاریاں اور ناسازگاریاں دونوں ہی سُود مند ثابت ہوا کرتی ہیں۔ وہ آسائشوں سے کام لینا جانتا ہے اور مشکلات کو سَر کرنے کی اِس میں ہمّت ہوتی ہے۔

اسی طرح اسے ماضی کی یاد بھی پریشان نہیں کرتی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اپنے زمانۂ گزشتہ سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ ماضی پر اُس کی نظر ہوتی ہے، لیکن یہ نظر نقّادانہ حیثیت رکھتی ہے، وہ گزُرے ہوئے لمحوں کے خیال میں گم ہو کر اپنے حال کی سنگین حقیقتوں کو فراموش نہیں کرتا۔ اس کے سامنے ماضی کے تجربات ہوتے ہیں، جن کی روشنی میں وہ حال کی گتھیاں سلجھانے کے ادب آداب سے آگاہی حاصل کرتا رہتا ہے اور اس طرح اس کا ماضی اس کے حال کو سنوارنے اور نکھارنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے، کچھ اِسی قسم کا سکُون ایک مطمئن شخص اپنے مستقبل کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ اسے آئندہ کا خیال پریشان نہیں کرتا۔ اپنے حال پر اس کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ آنے والے واقعات کے متعلق اس کے دل میں کسی طرح کے خدشات نہیں ہوتے۔ اُسے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے، وہ حال کی ذمّہ داریوں کا خیر مقدم اس انہماک سے کرتا ہے کہ اس کے مستقبل کے راستے خود بخود روشن اور متعیّن ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ہم اطمینان کی اس کیفیّت کو سکون کی کیفیّت سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ ایک مطمئن شخص کا دل کسی وقت بھی ولولہ و جوشِ حیات سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی امنگوں کو بڑی حد تک اپنی قابو میں رکھتا ہے اور انھیں بے لگام نہیں ہونے دیتا۔ شاید اسی اختیار و ضبط کی وجہ سے ہمیں بادی النظر میں ایک مطمئن شخص یوں معلوم ہونے لگتا ہے جیسے وہ اپنی موجودہ

حالت پر قانع ہو گیا ہے اور اس میں قناعت کی بدولت افسردگی پیدا ہو چلی ہے اور غالباً اسی غلط فہمی کے تحت لوگ اطمینان کو جمود کے مترادف سمجھ لیتے ہیں۔

اطمینان میں قرار کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اسے ہم جمود یا افسردگی کا نام اس لیے بھی نہیں دے سکتے کہ یہ قرار کسی پژمردگی کا اظہار نہیں کرتا۔ اس قرار میں حالات پر قابو پانے اور زندگی کو سمجھنے سمجھانے کی جرأت و قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ قرار اطمینان رکھنے والے شخص کی عالی ہمتی اور اس کے اعتماد کی نشاندہی کرتا ہے۔ اسے یہ قرار اس لیے حاصل ہوتا ہے کہ اس کے دل میں کوئی خوف نہیں ہوتا یا وہ جو کچھ کرتا ہے اُس میں پورے خلوص اور سوچ بچار کی صداقت موجود ہوتی ہے۔ اطمینان کا یہ مثبت پہلو کسی درماندگی کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس میں قدم آگے بڑھانے کی ہمتیں اور عزائم مکمّل آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔

اس بحث کے بعد کہ اطمینان کیا ہے، اب ہم مختصر طور پر یہ دیکھتے ہیں کہ اسے کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ویسے تو ہر انسان کی زندگی میں لاشعوری طور پر کبھی نہ کبھی تھوڑے بہت وقفوں کے لیے اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اس حیات افروز کیفیت کی دیرپائی کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے ذوق اور رجحانِ طبع کے مطابق کچھ نہ کچھ کام کرتا رہے۔ اطمینان کے لیے حرکت سب سے پہلی شرط ہے۔ ایک مطمئن شخص کی زندگی میں کاہلی اور بے عملی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ وہ اطمینان سے کام کرتا رہتا ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کے کام زیادہ تر اپنے مذاق کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہاں اپنے ذوق اور رجحانِ طبع کا لحاظ اس لیے لازمی ہے کہ ایسا کام جو کسی جبر کے تحت کیا گیا ہو (چاہے وہ کام کتنا ہی اعلیٰ اور قابلِ قدر کیوں نہ ہو) ایک انسان کو اور بہت کچھ بخش سکتا ہے، اطمینان کی دولت سے فیض یاب نہیں کر سکتا۔

لیکن اس سے یہ مطلب بھی اخذ نہیں کر لینا چاہیے کہ ایک مطمئن شخص اپنی طبیعت

کے خلاف کوئی کام کر ہی نہیں سکتا ـــــ وقت پڑنے پر ایک مطمئن شخص خلافِ طبع کام کو بھی اس خوبی کے ساتھ سرانجام دیتا ہے، جس خوبی سے وہ اپنے مذاق کے مطابق کاموں کی تکمیل کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ ایسے کاموں سے جن کے لیے اس کی طبیعت آمادہ نہیں ہوتی اس چابک دستی کے ساتھ کنارا کشی اختیار کرتا ہے جس سے اس کی زندگی پر کوئی منفی اثر نہیں پڑتا۔ دراصل وہ موجودہ صورتِ حال پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے خلافِ طبع کاموں کو خندہ پیشانی سے سرانجام دیتا ہے، ورنہ اس کی کوشش یہی رہتی ہے کہ جلد از جلد وہ اپنے رجحانِ طبع کے کاموں میں مصروف ہو جائے، چنانچہ اطمینان حاصل کرنے کے لیے جہاں انسان کو باقاعدہ جدّوجہد کرنی ہوتی ہے۔ وہاں اسے یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس کی طبیعت کا رجحان کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ اپنے رجحانِ طبع کو معلوم کرنا آسان کام نہیں ہے، لیکن اگر غور و فکر سے کام لیا جائے، تو یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا حل ہمیں نظر نہ آئے۔ بڑے بڑے لوگوں کے سوانح اُٹھا کر دیکھ لیجیے۔ ان کی زندگی میں اُسی وقت اطمینان کا آغاز ہوتا ہے، جب سے انھیں یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ ان کی طبیعت کا رُجحان انھیں کون سے کاموں کی طرف اُبھار رہا ہے۔ اگر ایک انسان باقاعدہ کام کرتا رہے اور فرصت کے لمحوں میں اپنی ذہنی صلاحیتوں پر غور کرتے ہوئے یہ دیکھ لیا کرے کہ وہ زندگی کے کس شعبہ میں احسن طریقہ سے کام کر سکتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے اطمینان ایسی بے بہا دولت حاصل نہ ہو اور وہ زندگی میں کامیاب انسان نہ کہلائے۔

کسی فرد کی زندگی میں بے اطمینانی کی کیفیّت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ بے عمل ہو جاتا ہے اور اپنی ذہنی صلاحیتوں کے بارے میں سوچنا ترک کر دیتا ہے۔ یہی مثال ایک معاشرے پر صادق آتی ہے۔ اگر کسی سوسائٹی کے افراد کام سے جی چراتے ہیں اور اپنی خداداد

صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی فکر نہیں کرتے، تو ایسی سوسائٹی کو اطمینان نصیب نہیں ہوتا اور وہ ہمیشہ بے اطمینانی کا شکار رہتی ہے۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے افراد ناکام زندگی گزارتے ہیں، چنانچہ فرد اور معاشرہ دونوں کی کامیابی کے لیے اطمینان کا حصول نہایت ضروری ہے۔
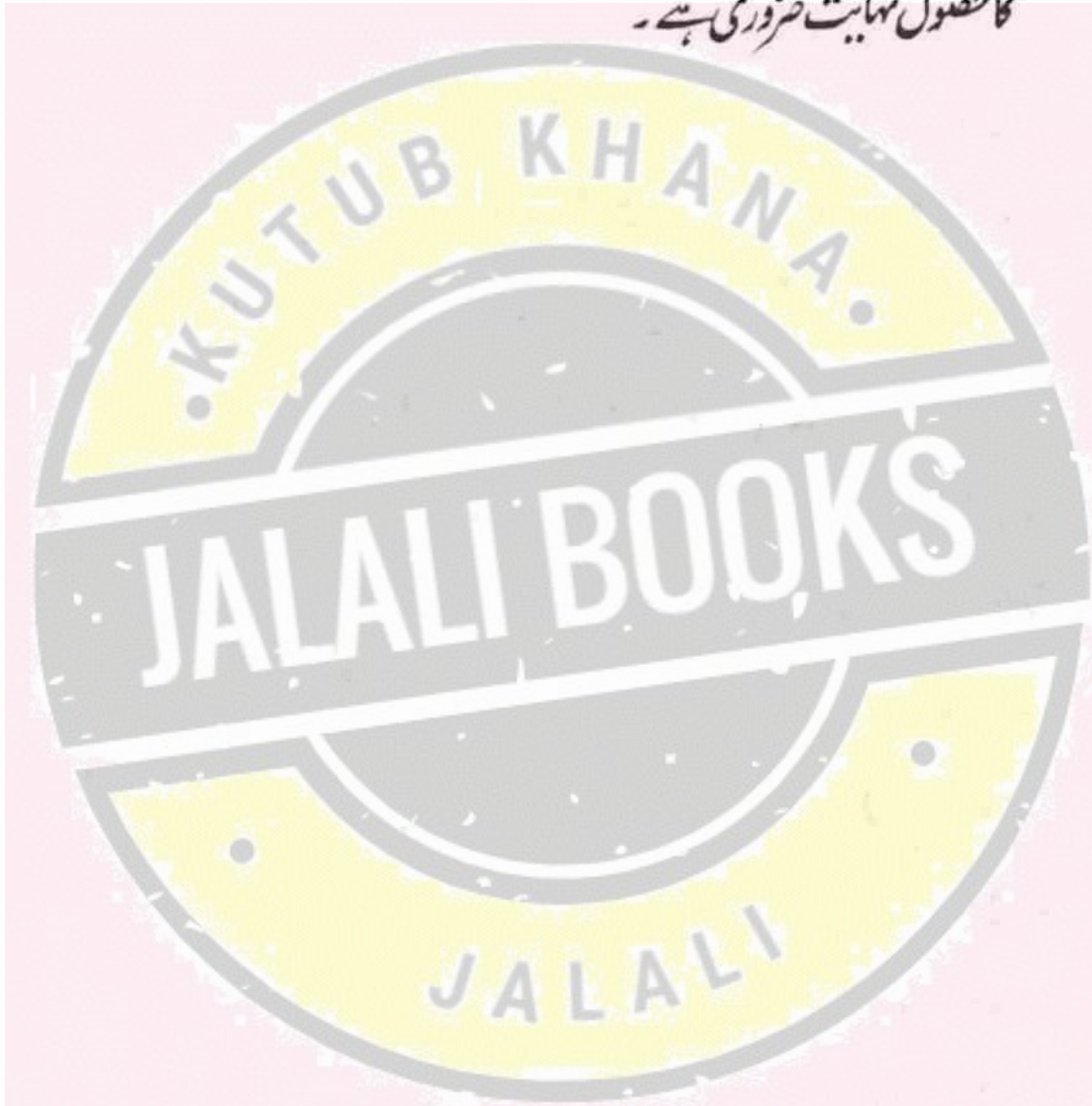
دشمن بنائیے

لوگ کہتے ہیں دوست مشکل سے ملتا ہے۔ میں کہتا ہوں ہمارے ہاں دوستوں کی کمی نہیں۔ جس طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھیے دوست ہی دوست نظر آتے ہیں۔ دشمن تو کوئی برائے نام بھی دکھائی نہیں دیتا۔ معلوم نہیں لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ اگر کبھی کوئی اکا دکا دشمن نظر بھی آتا ہے، تو اُسے قریب سے دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اِن حضرت نے دشمنی کا محض لبادہ اوڑھ رکھا تھا، ورنہ یہ بھی عامتہ النّاس کے زُمرے میں شامل ہیں۔ دُوست نہیں ملتا۔ دوست مشکل سے ملتا ہے، سب جھوٹ سب بے کار کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اب تو ہمیں یہ فریاد کرنی چاہیے کہ اے لوگو! اگر جینا چاہتے ہو تو دشمنی کی پُل صراط پر چلو۔ دشمن بناؤ، زندگی میں دُشمنی کے بغیر کوئی حرارت پیدا نہیں ہوتی۔

معلوم نہیں دوستی کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں دوست بنانا بہت ہی آسان کام ہے اور دشمن بنانے کے لیے کافی جگر داری کی ضرورت ہے۔ دُشمن بنا کر آدمی چین کی نیند نہیں سو سکتا اور دوست بنا کر غفلت کی نیند سو جاتا ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم میں کچھ باقی نہیں رہا، ہم بے جان ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ کسی معاشرے کے افراد میں ایک اعتبار سے دوستوں کی بہتات اِس

بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس معاشرے کی موت کے دن قریب آ چلے ہیں۔

ممکن ہے آپ کی نگاہ میں دوستی کا کوئی اعلیٰ مفہوم موجود ہو، لیکن میں تو اِس لفظ کے اُس عام معنی سے بحث کرنا چاہتا ہوں جس سے ہمیں اور آپ کو روزمرّہ زندگی میں سابقہ پڑتا رہتا ہے۔

آج کل دوستی کا معیار یہ ہے کہ آپ اپنی ہستی کو نظر انداز کر دیں اور اپنے دوست کی ہاں میں ہاں ملاتے چلے جائیں، دوست اگر دن کو رات کہے، تو آپ بھی رات کہیں؛ اِسی طرح اگر وہ رات کو دن کہے تو آپ بھی دن کہیں، مطلب یہ ہے کہ آپ کو اپنے دوست کے خیالات سے ذرّہ برابر اختلاف نہیں رکھنا چاہیے۔ اس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ پر مُہرِ تصدیق ثبت کی جائے۔ اب آپ ہی فرمائیے اپنی ذات کو پسِ پُشت ڈال کر دوست بنانا کونسی بڑی بات ہے۔ جس شخص کے ساتھ بھی آپ اِس قسم کا سلوک روا رکھیں گے وہی آپ کا دوست بن جائے گا۔

ہاں میں ہاں ملانے والا شخص اِس لیے ہر ایک کو دوست بنا لیتا ہے کہ اُس کی ذات سے کسی کو بظاہر کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔ اِس کے علاوہ جب آپ کسی کے خیالات سے اتّفاق کرتے چلے جاتے ہیں تو اُس کی اَنا کو یک گونہ تسکین حاصل ہوتی ہے جس کے نتیجے میں وہ آپ کو پسند کرنے لگتا ہے یا کم از کم آپ کی موجودگی اس کے لیے اُکتاہٹ کا باعث نہیں بنتی؛ چنانچہ اس طرح ہاں میں ہاں ملا کر دوست بنانا آسان کام تو ہے، لیکن اِس آسانی کے ساتھ بہت سی قباحتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ سب سے پہلی قباحت تو یہی ہے کہ جی حضوری کی عادت کے تحت آپ اپنی شخصیت کو تباہ کر ڈالتے ہیں، دوسرے کی ہر بات پر ہاں کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ جو کچھ کرتے ہیں، جو کچھ دیکھتے ہیں، جو کچھ سُنتے ہیں، جو کچھ سوچتے ہیں سب اپنے ہاتھ پاؤں

آنکھ، کان اور دماغ سے نہیں ؛ بلکہ دوسروں کے اعضا کے ذریعے۔ آپ کے اس عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے جیسے آپ کا وجود برائے نام رہ گیا ہے۔ انفرادیت کے اِس فقدان کے ساتھ آپ کی اپنی شخصیت صفر ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو صلاحیتیں آپ کی ذات میں مضمر ہوتی ہیں وہ ناکارہ ہو جاتی ہیں۔

ہر شخص اپنی ذات میں صلاحیتوں کی ایک دُنیا پوشیدہ رکھتا ہے۔ اگر ان صلاحیتوں سے کام لیا جائے، تو زندگی کے خد و خال میں بانکپن پیدا ہوتا ہے۔ کائناتِ عالم کی تقدیریں بنتی اور سنورتی ہیں، لیکن ان صلاحیتوں سے اسی وقت کام لیا جا سکتا ہے جبکہ انھیں پوری طرح پروان چڑھانے کا موقع میسّر آیا ہو اور یہ موقع اُسی وقت میسّر آتا ہے جب انسان اپنے سے باہر کی دنیا کے ساتھ ٹکّر لینے کی سعی کرتا ہے۔ باہر کی دُنیا میں سب سے بڑی قوّت (نیچر کو چھوڑ کر) جس سے انسان کو مقابلہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے وہ دوسرے لوگوں کے اعتقادات و خیالات ہیں۔ یہ اعتقادات و خیالات درست بھی ہو سکتے ہیں اور نادرست بھی۔ لیکن دونوں صورتوں میں ایک واقعی زندہ فرد کے لیے ان سے مقابلہ ضروری ہو جاتا ہے۔ درست صورت میں مقابلہ اس لیے ضروری ہے کہ خیالات ہزار صحیح ہوں، لیکن ان کی بقا اور ارتقا کے لیے لازم ہے کہ ان میں وسعت پیدا کی جائے اور انھیں آگے بڑھایا جائے۔ جس وقت ان خیالات کو وسعت دی جاتی ہے اُس وقت رجعت پسند اشخاص بُری طرح حائل ہوتے ہیں۔ اب اگر رجعت پسندوں سے خوف کھایا جائے، تو سمجھیے ارتقا کو ضعف پہنچا اور اگر ان سے مقابلہ کیا جائے، تو ظاہر ہے ان کو دشمن بنا لیا، جو لوگ حوصلہ مند ہوتے ہیں وہ خوفزدہ ہونے کے بجائے دُشمنی مول لینے کو پسند کرتے ہیں اور اِس طرح زندگی کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اب رہا نادرست خیالات کا سوال، سو اِس بارے میں یہ عرض

ہے کہ جب خیالات و اعتقادات ہیں ہی غلط، تو پھر ان کو کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن چونکہ ان کو برداشت کرنے میں لوگوں کو عافیت نظر آتی ہے۔ اس لیے ہوتا یہ ہے کہ لوگ ان سے مقابلہ کرنے کے بجائے ان کے سامنے سپر ڈالنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ کسی معاشرے میں غلط اقدار و خیالات کا رواج پا جانا بہت آسان ہوتا ہے۔ وجہ اِس کی یہ ہے کہ غلط اقدار و خیالات کی بنیاد انسان کی نفسانی خواہشات پر ہوتی ہے جن کی بدولت وہ اپنے جذبات کو جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ تسکین پہنچانا چاہتا ہے، چنانچہ ایسے حالات میں جبکہ کسی معاشرے میں غلط اقدار و خیالات فروغ پا چکے ہوں لوگوں کو دوست بنانا یا دوستی کی فضا پیدا کرنا خود اپنے آپ کو اور اُس معاشرے کو موت کے مُنہ میں دھکیلنے کے مترادف ہے۔ ایسی حالت میں دوست بنانے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ان غلط اقدار و خیالات کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دوستانہ رویے سے نہ صرف افراد کی ذات فنا ہو جاتی ہے، بلکہ پوری قوم قعرِ مذلّت میں گر کر اپنے آپ کو ختم کر لیتی ہے۔ رشوت لینے والوں کو رشوت دے کر، غلط سفارش کرنے والوں کی سفارشوں پر عمل پیرا ہو کر دوسروں کا حق چھینا ہوا اپنے عزیزوں اور دوستوں کو دے کر اور اِسی طرح کے دوسرے عیوب میں شریک ہو کر آپ ان لوگوں کو وقتی طور پر دوست بنا سکتے ہیں، لیکن اس وقتی دوستی کی وجہ سے آپ کی ذات اور آپ کی پوری زندگی کو جس نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے آپ اس کا اُس وقت اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ہم ایسی صورتِ حال کو معاشرتی بے حِسی کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

یہ دُرست ہے کہ خطروں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا اور آرام سے زندگی گزارنا انسان کی فطرت میں داخل ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خود کو خطرات میں ڈالے بغیر زندگی میں حُسن پیدا نہیں ہوتا۔ ایک کامیاب اور بھرپور زندگی گزارنے کے لیے آدمی کو جذبۂ ایثار سے

سرشار ہونا پڑتا ہے۔ زمانے کی ہوا کے رُخ چلنا آسان تو ضرور ہے، لیکن یہ کام انسانی زندگی کی آب و تاب چھین لیتا ہے، چنانچہ جس معاشرے کے افراد باعزّت اور بھرپور زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں وہ کسی صورت میں بھی انسان دشمن خیالات کو رواج نہیں پانے دیتے۔ غلط اقدار و خیالات سے اِن کی جنگ برابر جاری رہتی ہے۔ وہ کسی طرح بھی اخلاق سوز عناصر کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اُن کی آنکھوں کو خواہشات کی چمک دمک خیرہ نہیں کرتی۔ اُنھیں ایسی زندگی ہرگز گوارا نہیں ہوتی جس میں دوسرے انسانوں کا حق مار کر راحت و آرام کی صورتیں پیدا کی گئی ہوں۔ وہ ایسے لوگوں کو کبھی دوست نہیں بناتے جو اپنے مفاد کی خاطر پوری قوم کو تباہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اُن کی ساری زندگی دشمن بناتے گزر جاتی ہے۔ وہ ہزاروں طرح کے دُکھ اُٹھاتے ہیں، تکالیف برداشت کرتے ہیں، لیکن غلط اقدار و خیالات کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے۔ عام حیوانوں کی طرح کوئی زندگی بسر کرنا چاہے، تو دوسری بات ہے، ورنہ صحیح معنوں میں ایک انسان کی زندگی بسر کرنے کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ اُن صالح اقدار و خیالات کی حفاظت کرنے میں انھیں ترقی اور فروغ دینے میں سر دھڑ کی بازی لگا دی جائے جن صالح اقدار و خیالات کی بقا کے ساتھ انسانیت کی بقا وابستہ ہے۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ اِس بازی میں فتح و شکست دونوں صورتوں میں ایک انسان کے لیے عزّت و حشمت کا سامان موجود ہوتا ہے۔

قدر و منزلت

شاعر ادیب اور فن کار بیچارے تو مُفت میں بدنام ہیں، ورنہ زمانے کی ناقدر شناسی کا شکوہ کون نہیں کرتا۔ ہر انسان اپنی جگہ یہی سمجھتا ہے کہ زمانے میں جیسی اُس کی قدر ہونا چاہیے تھی ویسی نہیں ہوئی۔ اس کے ذاتی جوہر کو کسی نے نہیں پرکھا۔ کوئی اتنا صاحب بصیرت نہ ہوا جو اس کی خوبیوں کو دیکھ سکتا۔ کسی کو اتنی سعادت نصیب نہ ہوئی کہ اُس کی قابلیت کا صحیح اندازہ لگا سکتا، اگر زمانے نے اس کی قدر و منزلت کی ہوتی، تو نہ جانے اب تک دُنیا میں وہ کیا کر چکا ہوتا، کیسے کیسے کارہائے نمایاں اس کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچ چکے ہوتے"۔ غرض اس نہج پر سوچتے ہوئے ہر شخص زمانے کا شاکی نظر آتا ہے۔ دراصل جب ہم زمانے سے اِس انداز میں گلہ شکوہ کرتے ہیں، تو ہماری مراد بھی یہی ہوتی ہے کہ دُنیا والوں نے ہمیں وہ مقام نہیں دیا جس کے ہم اہل تھے۔

جہاں تک انسان کی فطری صلاحیتوں کا تعلّق ہے، ہمیں یہ مان لینے میں کوئی عُذر نہیں ہونا چاہیے کہ قریب قریب ہر شخص میں کوئی نہ کوئی صلاحیّت موجود ہوتی ہے۔ لیکن جس چیز کو ہم قابلیّت یا اہلیت کہتے ہیں کیا وہ چیز محض اس صلاحیّت کی موجودگی کو تسلیم کر لینے سے معرضِ وجود میں آجاتی ہے؟ اگر قابلیّت کے یہی معنی ہیں، تو واقعی ہر شخص قابل ہے اور زمانے سے اُس کی شکایت دُرست، لیکن مشکل یہ ہے کہ قابلیّت اس کا نام نہیں ہے۔ کسی کام کی صلاحیّت رکھنے

اور اس کام کے اہل ہونے ہیں زمین آسمان کا فرق ہے۔ صلاحیّت کا تعلق انسان کی پیدائش سے ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے کسی جدّوجُہد کی ضرورت پیش نہیں آتی — یہ ایک ایسا انعام ہے جو انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اہلیّت یا قابلیّت پیدا کرنے کے لیے انسان کو جدِّوجُہد کرنا ہوتی ہے — یوں ایک شخص میں ہزار قسم کی صلاحیتیں موجود ہوں، لیکن اگر وہ ان صلاحیتوں کو کام میں لانے کے لیے کوشش نہیں کرتا، تو ایک دن اس کی یہ تمام صلاحیتیں ناکارہ ہوکر رہ جاتی ہیں۔ صلاحیتوں کو ہم انسانی ذہن کی اُن قوّتوں سے تعبیر کرسکتے ہیں جن کے بل بُوتے پر وہ مختلف قسم کے کام سرانجام دے سکتا ہے۔ ان قوّتوں سے کیسے کام لیا جاسکتا ہے، اِس چیز کا نام اہلیت یا قابلیّت ہے۔

انسان روزِ ازل سے زمانے کی ناقدری کا شکوہ کرتا چلا آرہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو اس کے دل میں آرزوؤں کے طوفان اُٹھتے رہتے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے کام تکمیل کو پہنچائے، کائنات کو تسخیر کرے، اپنے نام کے ڈنکے بجوائے۔ دوسری طرف اس کی فطرت میں راحت پسندی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہے۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتا ہے، لیکن ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ سب کام کر ڈالے، لیکن اِس طرح کہ اِسے کچھ نہ کرنا پڑے۔ وہ محنت اور مشقّت سے جی چُراتا ہے۔ اِس لیے عام حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ انسان آرزؤں اور خواہشوں کی پرورش تو دل میں کرتا رہتا ہے، اُن کو عملی صورت دینے کے لیے صعوبتیں برداشت نہیں کرتا — محض دل میں تمنّا کرلینے سے یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ بہت بڑی شخصیت کا مالک ہے۔ وہ اِس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ تکمیلِ آرزو کے لیے سعی وعمل نہایت ضروری ہیں، صرف خیالی گھوڑے دوڑانا کافی نہیں؛ چنانچہ حقائق سے اِس چشم پوشی کی بنا پر وہ ایک عجیب خطرناک قسم کی غلطی کا مرتکب ہوجاتا ہے۔ یعنی خود کو اپنی تن آسانی پر بُرا بھلا کہنے کے بجائے

زمانے کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ باعمل ہوتے ہیں اور اپنی آرزوؤں کی تکمیل محض خواب دیکھنے کے ذریعے نہیں کرتے، اُن کی زبان پر زمانے کی شکایت بہت کم آتی ہے۔ ان لوگوں کو ذوقِ عمل کی تند صہبا کا نشۂ یقین کی اس منزل پر پہنچا دیتا ہے، جہاں پہنچ کر ان کا یہ ایمان ہو جاتا ہے کہ ان کی محنت کسی طور پر بھی رائیگاں نہ جائے گی وہ پورے یقین کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ زمانہ ان کی ضرور قدر کرے گا۔ اوّل تو یہ حضرات وقتی طور پر زمانے کی مدح و ستائش سے ہی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ وقتی طور پر میں نے اس لیے کہا ہے کہ زمانے سے قدر و منزلت کے وہ طلبگار ضرور ہوتے ہیں، لیکن عمل کے وقت اُن کے سامنے سب سے اہم مسئلہ اس کام کی تکمیل ہوتی ہے۔ اگر ان کا وہ کام جس کو سرانجام دینے کا بیڑہ اُنھوں نے اُٹھایا ہے بخیر و خوبی انجام کو پہنچ گیا تو سمجھیے ان کو قیمت وصول ہو گئی۔ اس کے بعد انھیں پُورا پُورا اعتماد ہوتا ہے کہ زمانہ ان کے کام کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی نے کوئی قابلِ قدر کام کیا ہے، تو پھر ناممکن ہے کہ اسے زمانے کی طرف سے اس کام کی اہمیت کے مطابق قدر و منزلت کی خلعت عطا نہ کی جائے۔ انسان سمجھنے کی کوشش نہ کرے تو اور بات ہے ورنہ زمانے سے زیادہ قدر دان کون ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں یہ نہایت مناسب ہوگا اگر یہاں اس بات کی وضاحت کر لی جائے کہ اس مضمون میں یا ایسے موقعوں پر بات چیت کرتے وقت زمانہ سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں جب ہم اس قسم کے موقعوں پر زمانے کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہمارا مطلب ایک عہد کے صحیح الدّماغ اور بالغ نظر افراد سے ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں سمجھ لیجیے کہ زمانہ کسی دورِ حیات یا ہر دورِ حیات کے ذی شعور اور بالغ ذہن کا نام ہے، لیکن مشکل یہ ہے

کہ ہم جذبات میں آ کر کسی عہد کے ذی شعور اور بالغ ذہن کو وسعت دینے کے بجائے اُسے اُن چند افراد تک محدود کر دیتے ہیں جو کسی نہ کسی طور سے بااثر کہلاتے ہیں۔ اب چونکہ چند در چند وجوہات کی بنا پر جب ہمیں اِن افراد کی طرف سے اپنے کیے ہوئے کام کی پُوری طرح داد نہیں ملتی، تو ہم زمانے کی شکایت شروع کر دیتے ہیں حالانکہ زمانہ صرف انہی چند اربابِ اثر تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا حلقۂ اثر دوسرے بے شمار لوگوں تک پھیلا ہوا ہے، یعنی زمانے میں ہم اور آپ سب شامل ہیں۔

کسی عہد کا ذی شعور اور بالغ ذہن جسے میں نے یہاں زمانہ سے تعبیر کیا ہے، اس قدر انصاف پسند ہوتا ہے کہ اسے کام کرنے والوں کو سر آنکھوں پر بٹھائے بغیر چین نہیں آتا۔ یہ اگر وقتی طور پر آپ کو سر آنکھوں پر نہ بھی بٹھا سکے، تو اپنے دل میں ضرور جگہ دے گا۔ میرا مطلب ہے، اگر کسی وجہ سے زمانہ آپ کے کام کی بظاہر داد نہیں دے سکتا، تو وہ دل سے آپ کا ضرور قائل ہو گا۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض وقت ہم کسی کے کام کی تعریف کرنا چاہتے ہیں، لیکن مصلحتِ وقت کی بنا پر یا کسی خوف یا تعصب کی وجہ سے خاموشی اختیار کر لیتے ہیں، لیکن ہماری اِس خاموشی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ ہمارے دل نے بھی اس شخص کے کام کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ جب کبھی موقع آتا ہے یا ہماری آنکھوں سے تعصب کا پردہ اُٹھتا ہے، ہم اس شخص کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ زمانے کی قدر دانی میں دیر ہو سکتی ہے اندھیر نہیں۔

آپ فرمائیں گے دیر کا سوال ہی تو اہمیت رکھتا ہے، اگر ہمارے کسی کام کو زمانے نے اُس وقت قدر کی نگاہ سے دیکھا، جب ہم اِس دُنیا میں نہ ہوئے، تو اس سے ہمیں کیا فائدہ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ زمانہ آپ کے کام کو آپ کی زندگی میں تھوڑا بہت بھی پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھے۔ کچھ نہ کچھ قدر و منزلت آپ کو زندگی ہی میں زمانے کی طرف سے حاصل ہو جاتی

ہے۔ اِس کے علاوہ جس وقت آپ پُورے خلوص کے ساتھ کسی کام کو انجام دیتے ہیں، تو آپ کو اپنے کام کی اہمیّت پر اس درجہ یقین ہوتا ہے کہ آپ ہزار مخالفتوں کے باوجود اس کی عظمت اور ضرورت کے قائل رہتے ہیں اور آپ کو اطمینان ہوتا ہے کہ ایک نہ ایک دن آپ کے کام کی ضرور قدر کی جائے گی ــــ مزید برآں آپ کے اِس یقین اور اطمینان میں مسرت و شادمانی کے اتنے خزانے پوشیدہ ہوتے ہیں جن کی بدولت آپ زمانے کی قدر و منزلت ہی سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر غالب کو اس کے اپنے زمانے میں بہت کم سمجھا گیا۔ اسی ناسمجھی کی وجہ سے لوگوں نے اسے مہمل گو کہنا شروع کر دیا تھا، لیکن چونکہ غالب کو اپنے ذوق اور وجدان پر پُورا پُورا یقین تھا، اس لیے وہ زمانے کی مدح و ستائش سے بلند ہو کر تخلیقِ شعر کے کرب برداشت کرتا رہا ہے

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

زمانے سے ہماری شکایت کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ہم زمانے کو اپنی زندگی کی مدّت تک محدود سمجھتے ہیں، جس کی بنا پر ہمیں یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ اگر ہماری زندگی میں ہمارے کام کی قدر نہ ہوئی تو بعد میں کیا ہو گی، حالانکہ زمانہ ہم سے پہلے بھی تھا اور ہمارے بعد بھی رہے گا۔ ہم مرجاتے ہیں لیکن زمانہ نہیں مرتا۔ اس لیے ہمیں زمانے کی اِس ہمیشگی کے پیشِ نظر یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ اگر کسی سبب ہماری زندگی میں ہمارے کام کو نہیں سراہا گیا، تو ہمارا مستقبل موجود ہے۔ قدر و منزلت کے امکانات ختم نہیں ہوئے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم سے کوئی ایسا کارنامہ سر انجام پا جاتا ہے جس کی اصل قدر و قیمت سے ہماری زندگی میں زمانے کے لیے کماحقہٗ واقف ہو جانا ناممکن ہوتا

ہے۔ ہم مستقبل کے چہرے کو بے نقاب کر رہے ہوتے ہیں، لیکن زمانے کی آنکھوں میں اتنا نور نہیں ہوتا کہ وہ اس کے خدوخال کا بخوبی مطالعہ کر سکے۔ ایسی صورت میں ہمارا یہ سمجھ لینا کہ زمانہ ہم سے بے انصافی کر رہا ہے، درست نہیں ہے۔ ایسے حالات میں، تو زمانے سے شکایت کے بجائے اُس پر رحم کھانے کو جی چاہتا ہے۔ ویسے ایک اعتبار سے اس ہستی کی حالت بھی قابلِ رحم ہوتی ہے، جو وقت سے پہلے پیدا ہو جاتی ہے۔ بہر حال جب زمانے کو ہمارے کسی کام کا پوری طرح شعور ہی نہیں، تو پھر ہم اس سے کسی قدر و منزلت کی کیوں کر توقع رکھ سکتے ہیں۔ زمانہ جان بوجھ کر کبھی ناقدری نہیں کرتا۔ یہ بالکل الگ بات ہے کہ چند وجوہات کی بنا پر وہ اپنی زبان سے قدر دانی کا اعتراف نہ کرے، لیکن اس کا دل ہمیشہ تسلیم کی منزلوں سے گزرتا رہتا ہے۔

قدر و منزلت کے بارے میں ہمیں زمانے کی طرف سے کوئی خوف و ہراس نہیں ہونا چاہیے۔ ناقدری کا سب سے بڑا خطرہ ہماری اپنی ذات میں پوشیدہ ہے۔ زمانہ ہماری بے قدری نہیں کرتا، ہم خود اپنے آپ کو اپنی اور دُنیا کی نظروں سے گرانے کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ قدر و منزلت کا سرمایہ انسان کا عمل ہے اور بے قدری کی سب سے بڑی وجہ اس کی بے عملی۔ جیسا کہ ابھی ابھی عرض کیا گیا ہے ہمیں اس بات پر فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں کہ زمانہ ہمارے کام کی قدر کرتا ہے یا نہیں، ہمیں تو یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا ہم کچھ کام بھی کر رہے ہیں، جس کی بنا پر زمانے سے عزت و حشمت کے طلبگار ہیں یا محض ہوائی قلعے بنا کر اپنے آپ کچھ سمجھنے لگے ہیں۔ زمانہ کا شاکی ہونے کے بجائے مناسب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ سے شکایت کے پہلو نکالتا رہے۔ اس سے دو طرح کے فائدوں کا امکان ہے۔ ایک تو زمانے سے شکایت نہ کرنے کی بنا پر انسان خواہ مخواہ کڑھنے اور اپنا جی جلانے سے محفوظ رہتا ہے

دوسرے اس طرح محاسبہ کرنے کی وجہ سے اس کی نگاہوں میں اپنی ذات کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہی اندازہ اور احتساب اسے فکر و عمل کی نئی نئی منزلیں دکھاتا ہے اور ہر منزل پر اس کی قدر و منزلت میں اضافے ہوتے رہتے ہیں۔
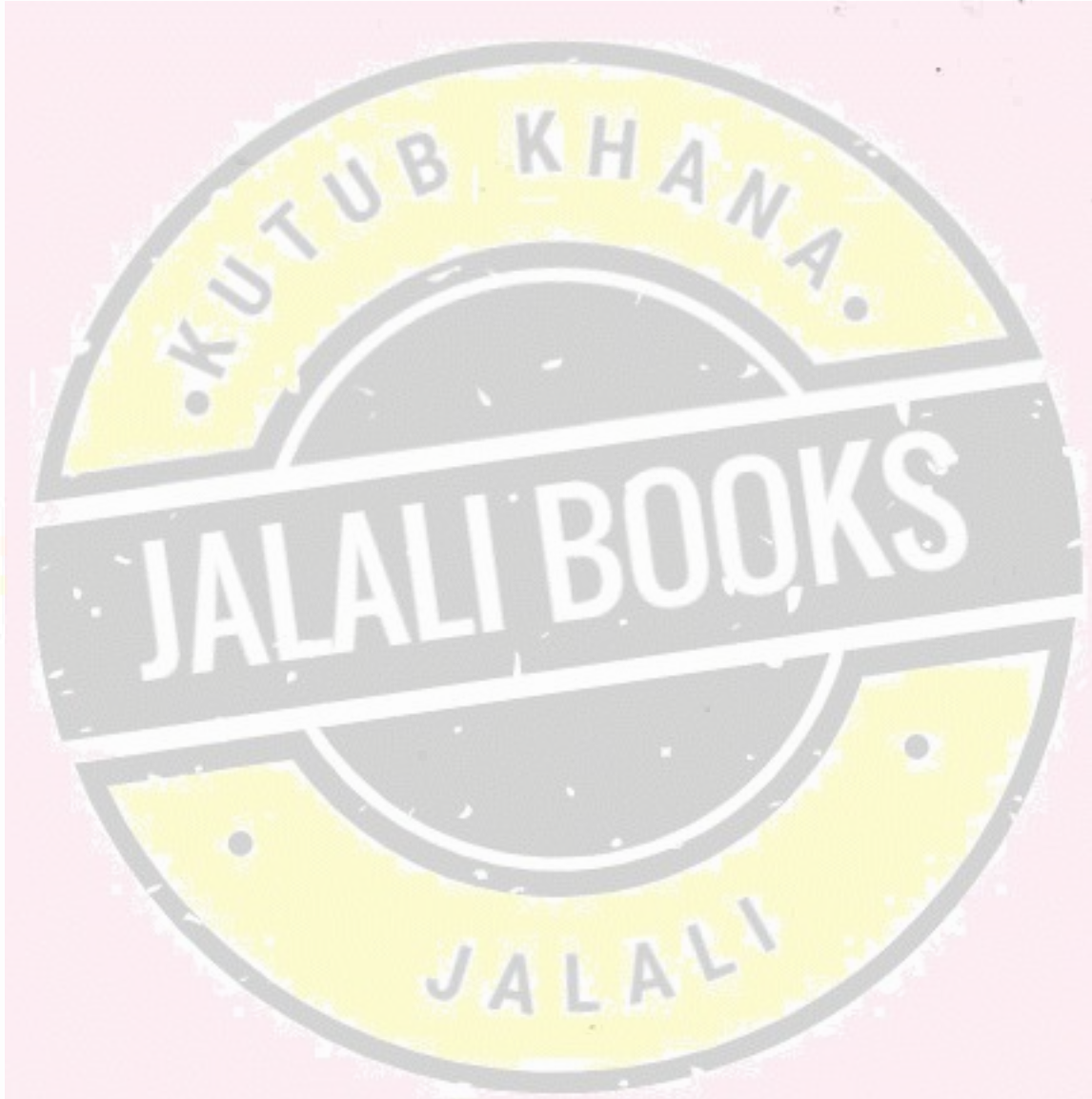
بکرے کی ماں.....

بکرا اور بکرے کی ماں ایک ساتھ جنم لیتے ہیں۔ ان میں جیتے جی کبھی جُدائی نہیں ہوتی۔ جُدائی ہو جائے تو نہ صرف بکرے اور اُس کی ماں کا خاتمہ ہو جائے، بلکہ روئے زمین پر کوئی جاندار باقی نہ رہے۔ ساری زندگی کا انحصار اِن کے اتّفاق پر ہے، لیکن اس قدر گہری وابستگی کے باوجود آج تک بکرے نے اپنی ماں کی صورت نہیں دیکھی۔ وہ اُسے اپنی قُربت کا ہر لمحہ احساس دلاتی ہے۔ اُسے پیار بھری نصیحتیں بھی کرتی ہے، مگر بکرے کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اُس کی ماں کہاں ہے۔ اُسے تو بس آوازیں آتی رہتی ہیں، خود اُس کے جسم کے روئیں روئیں سے پھوٹ کر — کبھی کبھی بکرا اِس معمّے سے تنگ آکر لاحول پڑھتا ہوا مُسکرا دیتا ہے اور خود سے کہنے لگتا ہے: "میاں بکرے تمہاری کوئی ماں نہیں ہے۔ تم بغیر ماں کے اس دُنیا میں آئے ہو اور یہ جو لگاتار تمہیں آوازیں آتی ہیں سب تمہاری اپنی آوازوں کی بازگشت ہے۔ لہٰذا اپنی آواز پر خواہ مخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

بکرا اِس فلسفے پر غور کرنا بیکار خیال کرتا ہے کہ اپنی آواز پریشان کرتی ہے یا دوسروں کی — اُس کے پیشِ نظر تو پریشانی سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ اگر اپنی آواز سے دُکھ ہوتا ہے، تو اُسے اَن سُنی کر دو اور اگر دوسروں کی آواز تنگ کرتی ہے، تو اُس پر دھیان نہ دو ——

بکرا جیسے ہی اپنی ماں کے وجود سے انکار کرتا ہے، وہ فوراً چلا اُٹھتی ہے: "ارے کم بخت! میں "ہوں" اور تیرے ہر رگ و ریشہ میں۔ تیری بوٹی بوٹی میرے وجود سے پھڑک رہی ہے — تُو میری ہستی کا منکر نہ ہو۔ میرا ہونا تیرے لیے باعثِ صد رحمت ہے" — بکرا پھر مان جاتا ہے — اور کہتا ہے: "اچھا ماں میں تیرے وجود کو تسلیم کرتا ہوں۔"

بکرے کی ماں کے ساتھ المیہ یہ ہے کہ اُس کے کوئی اولاد نہیں۔ یُوں تو اُس نے دُنیا بھر کو جنم دے ڈالا۔ بقائے نسل کی تنہا ذمہ دار خود اُس کی ذات گردانی گئی ہے، لیکن اِس کے باوجود وہ بے اولاد ہے۔ بکرے کی ولادت کا باعث بکرے کی ماں نہیں بکرے کی ماں نے بکرے کو جنم دیا ہو یا نہ دیا ہو، بکرے کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے، پل بھر کو اُسے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ ہر وقت اُس کے صدقے واری جاتی ہے۔ جب دیکھو بکرے کا نام زبان پر ہے۔ کبھی کبھی تو بکرا اپنی ماں کی اس حد سے زیادہ محبت سے سخت بور ہوتا ہے۔ لیکن کیا کرے محبت دیوانی ہوتی ہے۔ وہ یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا ہے۔

بکرے کی ماں تو بکرے سے محبت کرتی ہے، لیکن بکرا کیا کرتا ہے۔ اس بارے میں بکرے نے کبھی نہیں سوچا۔ البتہ وہ اتنا ضرور جانتا ہے کہ اگر ماں کا ادب اور احترام پیش نظر نہ ہوتا، تو وہ کبھی کا اُس سے دامن چھڑا کر بھاگ گیا ہوتا — سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بکرا اس طرح اپنی ماں سے جُدا ہو سکتا ہے؟ یہ دُرست ہے کہ بکرے کی ماں نہایت لاغر ہے۔ ہر وقت اُسے اختلاج کے دَورے پڑتے ہیں — دل کی پیدائشی مریض، چہرے پر رونق کا نام نہیں۔ بات بات پر مُنہ سے خون اُگلتی ہے، لیکن اس تمام ناتوانی کے باوجود اُس کی آواز میں ایک گونج اور دبدبہ ہے۔ بکرے غریب کی کیا بساط ہے، اُس کی آواز کو سُن کر

تو شیروں کا زہرہ آب ہوتا ہے ـــ بکرا اگر اپنی ماں کی صورت دیکھ لیتا، تو شاید اس بُری طرح اُس کے رعب میں نہ آتا، لیکن ماں کی گھمبیر آواز اُسے اتنی مہلت ہی کہاں دیتی ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی نگاہیں اُوپر اُٹھا سکے ـــ چنانچہ ماں کے لبوں کی ہلکی سی جُنبش پر بکرا ہانپتا کانپتا اُس سے آکر لپٹ جاتا ہے۔

دُنیا میں سب سے زیادہ فضول کام حفاظت ہے ـــ اور بکرے کی ماں کے سپرد یہی کام ہے ـــ اِس لحاظ سے بکرے کی ماں سے زیادہ دُنیا میں کوئی نکمّا نہیں۔ ہر وقت جاگتے رہنا۔ ذرا سی دیر کو غافل نہ ہونا۔ بکرے کی ذرا ذرا سی حرکت پر نگاہ رکھنا، اُس کے چھینکنے پر بے چین ہو جانا۔ بھلا سوچیے تو سہی، نیند، غفلت اور بے فکری کے بغیر کوئی کام تکمیل کو پہنچ سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ہزار نگہداشت کے باوجود بکرے کی ماں ایک نہ ایک دن بکرے سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ سب سے زیادہ غیر محفوظ چیز وہ ہے جس کی سب سے زیادہ حفاظت کی جائے۔ کام کرنے والے نہ محفوظ ہوتے ہیں نہ محافظ۔ وہ تو حفاظت کی دیواروں کو پھاند کر کام کرتے ہیں ـــ کام کو حفاظت سے نفرت ہے۔

بکرے کی ماں کو پیار کرنا آتا ہے۔ لوری دینا نہیں آتا۔ وہ غُصّہ سے قطعی ناآشنا ہے۔ غصّہ سے ناآشنائی پیار کو خطرناک بنا دیتی ہے۔ بکرے کی ماں کو بکرے پر جس قدر پیار آتا ہے اُسی قدر زیادہ وہ بکرے کا خون پیتی ہے۔

بھلا چاہنے والے بُرا چاہنے والوں سے بہتر نہیں ہوتے۔ بھلا کرنے والے البتّہ بُرا کرنے والوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ اپنے لیے تو ایک انسان کی خواہش اور عمل دونوں مفید ثابت ہو سکتے ہیں، لیکن دوسروں کے لیے عمل لازمی ہے۔ عمل کے بغیر نیک خواہش بھی محض ٹرخانے والی بات رہ جاتی ہے ـــ بدخواہوں سے زیادہ نرے خیرخواہوں سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ بکرے کی

ماں اُس کی خیرخواہ ہے یا بدخواہ کبھی کبھی بکرا اِس تذبذب میں بُری طرح مُبتلا ہو جاتا ہے۔ ویسے یہ لمحے اُس کی زندگی میں نہایت اہم ہوتے ہیں۔

مَثل مشہور ہے کہ جہاں دو برتن ہوتے ہیں، کھڑکتے بھی ضرور ہیں۔ بکرے اور اُس کی ماں میں بھی لڑائی ہو جاتی ہے۔ لیکن عام طور پر صُلح زیادہ رہتی ہے۔ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ بکرے پر ماں کا غلبہ ہے یا ماں پر بکرے کا۔ بظاہر ماں کا پلّہ بھاری معلوم ہوتا ہے۔ توازنِ اقتدار کے اصول سے ابھی تک دونوں نابلد ہیں۔ اگر یہ اِس اصول سے باخبر ہوتے تو نہ ماں حاوی ہونے کی کوشش کرتی اور نہ بکرا وقت بے وقت مچل جانا پسند کرتا۔ مثال کے طور پر بکری کے معاملہ میں وہ ہمیشہ ماں کو فراموش کر دیتا ہے بکرے کی ماں اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ غالبًا وہ بکری کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتی ہے اور سمجھے بھی کیوں نہ، بکرے کی ماں ایک بکرے کی خیر مناتی ہے اور بکری کے نزدیک اُسی ایک بکرے سے ہزاروں بکرے بنانا بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ تسلسلِ حیات بکری کو بے شمار سلام بھیجتا ہے۔

بکرے کی تقدیر سے خود بکرا اور اُس کی ماں دونوں واقف ہیں لیکن دونوں کی واقفیت میں فرق ہے۔ بکرا اپنی تقدیر کو اٹل سمجھتے ہوئے اُس پر مزید غور کرنا بیکار خیال کرتا ہے۔ وہ اُسے قطعی طور پر بھلا دینا چاہتا ہے۔ لیکن بکرے کی ماں بکرے کی تقدیر کو کسی وقت فراموش نہیں کرتی۔ زندگی کی راہ میں قدم قدم پر خطرے ہیں۔ وہ اُسے اِن خطروں سے بچانے کی فکر میں لگی رہتی ہے۔ اُس نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ بکرے کو اِن خطرات سے بچا کر وہ کہاں لے جائے گی۔ منزل سے بے نیاز ہو کر وہ تو اُسے بس بچانا چاہتی ہے۔ اُس کی اِس خواہش نے بکرے کو ٹانگوں، سینگوں اور آنکھوں وغیرہ کا محتاج بنا دیا۔ بکرے کی ماں نہ ہوتی تو بکرے کو اُس کا رُواں رُواں اُڑائے لیے پھرتا۔ اُس کا رُواں رُواں خطرے کے وقت سینگوں

کی طرح سخت اور نوکیلا ہو کر اُس کی حفاظت کرتا۔ اُس کے روئیں روئیں میں دیکھنے کی طاقت موجود ہوتی۔ اب وہ صرف دو آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، پھر وہ سارے جسم سے دیکھتا۔ دراصل اپنی جان کو بچانے کی جبلّت نے بکرے کے وجود کو موجودہ شکل دے کر عناصر کے قیدخانہ میں لا بٹھایا ہے۔ کبھی کبھی یہاں اُس کا دم بُری طرح گھُٹنے لگتا ہے۔ اُس کے دل و دماغ کی عجیب کیفیّت ہو جاتی ہے۔

جس وقت بھی بکرے کے خون میں آزادی اور وسعت کا جذبہ موجزن ہوتا ہے وہ اِس قیدخانہ سے نکل کر ساری فضا پر چھا جانا چاہتا ہے۔ وہ خود سے کچھ اس طرح باتیں کرنے لگتا ہے "میری ماں نے مجھے سخت بُزدل بنا دیا ہے۔ وہ مجھ سے پیار نہیں کرتی، بلکہ میری تمنّاؤں کا گلا گھونٹ دینا چاہتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ خواہشات کو فنا کر دینے سے میں امر ہو جاؤں گا، لیکن آج تک تو اُس کی یہ تمنّا پُوری نہیں ہو سکی ـــ میری تقدیر میرے سامنے ہے۔ مجھے ہر حال میں اُس کے حضور سر جھکانا پڑے گا۔ پھر میں اپنی آرزوں کو احترام کیوں نہ کروں ـــ میرے لیے ماں سے جُدائی نہایت ضروری ہے ـــ" بکرا جب اِس انداز میں سوچنا شروع کرتا ہے، تو اس کے دل میں کچھ کر گزرنے کی اُمنگ بے پناہ جذبے کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ اُسے اُس وقت اپنا وجود بے شمار قوتوں کا خزانہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ دُنیا کی ہر طاقت اُس کی نظر میں ہیچ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اُس کے دل میں کوئی خوف نہیں ہوتا۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہے۔ ایسے عالم میں اُس کی ماں کی آواز دب کر رہ جاتی ہے ـــ وہ چیختی ہے، چلّاتی ہے، شور مچاتی ہے، دہائی دیتی ہے ـــ لیکن بکرے کو کچھ سُنائی نہیں دیتا ـــ اُس وقت تو زندگی کے سارے خطرے اُس کی حفاظت کا ذمّہ لے کر اُس کے سامنے حاضر ہو جاتے ہیں۔ ذرّہ ذرّہ اُسے آزادی اور وُسعت کا پیغام دیتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ امر ہو جانے کا خواب

اُسے شرمندۂ تعبیر ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اُس کی نگاہوں میں خوش نصیبی کے لامتناہی سلسلے رقص کرنے لگتے ہیں۔ وہ بے اختیار ہو کر فضا میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ ہر طرف خون کے چھینٹے اُڑنے لگتے ہیں۔ ایثار، جرأت، آزادی، زندگی ــ اُس کی ماں اُسے دیکھتی رہ جاتی

گوشِ حقیقت نیوش

آپ نے اکثر مشاہدہ کیا ہوگا کہ جو شخص کھری بات کہنے کا عادی ہوتا ہے، لوگ اُس کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ ایسے شخص کی شہرت بھی اس کے خاندان اور حلقۂ احباب سے گذر کر جلدی ہی دوسرے افراد تک پہنچ جاتی ہے، عام سوسائٹی میں بھی ایسے شخص کو عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہمارے قومی شاعر علّامہ اقبال مرحوم کا یہ شعر تو آپ کو بخوبی یاد ہوگا ؎

حق گوئی و بے باکی آئینِ جواں مرداں
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ویسے حق گوئی کا شیوہ ہے بھی تعریف کے قابل۔ سچی بات وہی کہہ سکتا ہے جو خود سچا ہو (کم از کم اس بات کی حد تک) جس کی فطرت میں مکّاری اور عیّاری داخل ہوتی ہے ایسے شخص کو حق بات کہنے کی سعادت بہت کم حاصل ہوتی ہے۔ اخلاص، حق گوئی کی سب سے بڑی شرط ہے، چنانچہ حق گوئی کے وصف میں اگر کوئی رطب اللسّاں ہو تو ہمیں اس کی تائید کرنی چاہیے، لیکن جس طرح لوگ سچ بات کہنے والے کی تعریف کرتے ہیں،

اس طرح سچ بات کو ٹھنڈے دل سے سُننے والے کا

ذکر کرتے ہوئے آپ نے کسی کو نہیں سُنا ہوگا۔ حق نیوشی کے بارے میں اس قدر کم کہا گیا ہے کہ اگر اسے نہ کہنے کے برابر سمجھا جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حق بات کہنے اور سُننے میں کیا خاص امتیازی وصف ہے اور ان میں کونسی چیز زیادہ صبر آزما اور قابلِ ستائش ہے۔

حق گوئی کی زیادہ تعریف اس لیے کی جاتی ہے کہ عام انسانوں میں سچی بات سُننے کی تاب نہیں ہوتی۔ اگر حق بات سُننے کا لوگوں میں حوصلہ پیدا ہو جائے تو حق گوئی کی تعریف اس طرح نہ کی جائے جس طرح عام طور سے کی جاتی ہے، حق گوئی کی زیادہ تعریف کی اصل وجہ ہی یہ ہے کہ سچ بات کہہ کر انسان خود کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ جب کسی کو حق بات کہی جائے تو وہ اسے خاموشی کے ساتھ سُن کر اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ سُننے والا سچی بات سُن کر آگ بگولا ہو جاتا ہے۔

دراصل سچی بات انسان کی کسی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے، جس سے اس کی خودی مجروح ہوتی ہے اور یہ فطری امر ہے کہ انسان اپنی کمزوری کو چھپانا چاہتا ہے، چنانچہ اسی کوشش میں وہ اپنی کمی دُور کرنے کے بجائے سچ بات کہنے والے ہی کا دُشمن بن جاتا ہے۔

حق گوئی کی دشواریاں اور خطرات اپنی جگہ درست ہیں، لیکن انسان کی دلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو سکے سچ بات کہے، جو اطمینان سچ بات کہہ کر حاصل ہوتا وہ جھوٹ بول کر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حق گوئی کا جذبہ لاکھ دبانے کے باوجود اُبھر کر رہتا ہے۔ ایک معاشرے میں ظلم و ستم کو چاہے کتنا ہی فروغ حاصل ہو چکا ہو، لیکن حق بات کہنے والے اپنی جان پر کھیل کر بھی حق بات کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر حق گوئی کی زیادہ تعریف نہ

بھی کی جائے، پھر بھی یہ قدر ایسی نہیں کہ انسانی سوسائٹی میں قائم نہ رہ سکے۔ اس کی جڑیں تو فطرتِ آدم میں رچی بسی ہیں۔ اس کے برعکس سچّی بات سُننے کے لیے انسان کا دل بہت کم چاہا کرتا ہے۔ خصوصاً اگر وہ بات اس کی کسی بڑی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے، چنانچہ حق گوئی کی نسبت حق نیوشی کی قدر کو فروغ دینا اور اس کی تعریف کرنا زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے، ویسے بھی اگر انسان حق بات سننے کے عادی ہو جائیں، تو حق گوئی کی قدر کو خود بخود فروغ حاصل ہو جائے۔ لوگ سچّی بات کہتے ہوئے اس لیے ڈرتے ہیں کہ کوئی اسے سُننے پر آمادہ نہیں ہوتا، ورنہ سچ بات کہنے کو کس کا دل نہیں چاہتا؟

ہم یہ فیصلہ عموماً کر لیا کرتے ہیں کہ جادۂ حق گوئی بڑا پُرخطر ہے، لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اگر سچّی بات سلیقے سے کہی جائے، تو پھر اس کے خطرات بڑی حد تک باقی نہیں رہتے اور اس کی تلخی بھی کم ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ روزمرّہ زندگی میں اگر کوئی چاہے، تو معمولی سی ذہانت کے استعمال سے کسی خطرے کے بغیر حق گوئی کا شیوہ اختیار کر سکتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ طنز و مزاح کے پردے میں لوگ کیا کچھ نہیں کہہ جاتے۔ اگر یہی باتیں جو سلیقہ اور ذہانت سے کہی جاتی ہیں براہِ راست کہہ دی جائیں تو نتیجہ ظاہر ہے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس کے علاوہ ذہانت ہی پر کیا موقوف ہے بغیر ذہانت یعنی بلاواسطہ حق گوئی کے مواقع بھی ایک انسان کو میسّر آ ہی جاتے ہیں۔ ہم اپنے سے طاقتور کے سامنے حق بات کہتے ہوئے بے شک ڈر جاتے ہوں، لیکن اپنے سے کمزور کے رُوبرو حق بات کہتے ہوئے ہمیں کوئی خاص جھجک محسُوس نہیں ہوتی۔ مثلاً بیوی بچوں یا اگر بیوی نہیں تو صرف بچّوں اور گھر کے ملازموں پر تو حق گوئی کی مشق فرمانے کا کچھ نہ کچھ موقع مل ہی جاتا ہے، لیکن سچّی بات سُننے یعنی حق نیوشی کے ساتھ معاملہ اُلٹ ہے۔ حق بات سُننے والا خواہ طاقتور ہو خواہ کمزور۔ بات چاہے سلیقہ

سے کی گئی ہو یا بلاواسطہ، اس کا اثر کم و بیش ضرور ہوتا ہے۔ یعنی بات کی تلخی ہر حال میں اپنی جگہ موجود رہتی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ جو بات ذرا بنا سنوار کر کہی جاتی ہے وہ یک لخت محسوس نہیں ہوتی اور جو باتِ براہِ راست اور بلا تکلّف کہی جاتی ہے، اس کی تلخی فوراً محسوس کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق گوئی میں تو حق بات کہنے والا ذمّہ داری سے بچنے کے لیے اور اپنی حفاظت کی خاطر کچھ حربے بھی استعمال کر سکتا ہے۔ حق نیوشی میں غریب سُننے والے کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ بات کی تلخی کا ذائقہ چکھے، یہ الگ بات ہے کہ اس تلخی کا اس پہ کیا ردِّ عمل ہوتا ہے؟ کوئی اس کو مسکرا کر برداشت کرتا ہے (جسے ہم صحیح معنوں میں حق نیوش کہتے ہیں) اور کوئی حق بات سُن کر جھنجھلا اُٹھتا ہے اور اپنی اصلاح کے بجائے حق بات کہنے والے کا سر توڑ دینا چاہتا ہے (دوسری صورت عموماً بیش آیا کرتی ہے)، بہر حال حق بات سُننے والے کے لیے اس کی تلخی کا محسوس ہونا مسلّم ہے میں حق گوئی کی نسبت حق نیوشی کو اس لیے زیادہ قابلِ تعریف سمجھتا ہوں کہ اخلاقی اعتبار سے عام حالات میں سچ بات کہنے کی نسبت سچ بات سُننا زیادہ مستحسن اور بصیرت افروز ثابت ہوتا ہے حق گوئی تو بعض اوقات کُند ذہنی اور بے وقوفی کی علامت بھی بن جاتی ہے لیکن حق نیوشی ہر حال میں قابلِ تحسین رہتی ہے۔ حق گوئی اور بیوقوفی کا ساتھ اس وقت ہوتا ہے، جب ایک انسان دوسرے انسان کے جذبات کا خیال کیے بغیر سچ کہہ ڈالتا ہے۔

ہمیں حق بات کہتے وقت اکثر و بیشتر دوسروں کے احساسات کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور ہمیں خیال رکھنا بھی چاہیے۔ عام حالات میں ایسے مواقع بہت کم آتے ہیں، جن میں کسی کا لحاظ کیے بغیر سچّی بات کہہ دینا مناسب ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیجیے کہ روزمرّہ زندگی میں حق گوئی کے لیے سلیقہ چاہیے اور سلیقہ کے لیے ذہانت کی ضرورت ہے، لیکن چونکہ

عام انسان ذہانت کے استعمال میں ذرا کنجوس واقع ہوئے ہیں، اس لیے بات کی تمام نزاکت سننے والے پر آپڑتی ہے۔ صورت یہ ہے کہ اگر کوئی حق بات بے ڈھنگے پن سے بھی کہی گئی ہے، تو سننے والا اُس بات کو خندہ پیشانی سے سُن کر صورتِ حال کو قابو میں رکھ سکتا ہے اور پھر مزید یہ ــ کہ ایک متحمل مزاج سننے والا محض کہنے والے کی بدسلیقگی کو ہی برداشت نہیں کرتا، بعض اوقات ناحق بات کو بھی اسے حق بات کی طرح سہنا پڑتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ ایک آدمی بڑے دعوے کے ساتھ کسی غلط بات کو صحیح سمجھ کر حق گوئی کا نعرہ بلند کرتا ہے، سننے والا برافروختہ ہونے کے بجائے اُس کی غلط بات نہایت سکون کے ساتھ سُنتا ہے اور جب کہنے والا اپنی بات کہہ چکتا ہے، تو وہ (یعنی سننے والا) اُسی وقت یا کسی مناسب موقع پر کہنے والے کو حقیقت سے آگاہ کر دیتا ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا حق نیوشی کتنے خوبصورت انداز میں فتنہ و فساد کو فرو کرنے کا باعث بنتی ہے اور امن و عافیت کی نگہبان ثابت ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کھری بات سُن کر ایک دفعہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے کسی نے تڑاخ سے چپت رسید کر دی، چہرے کا رنگ بھی بدل جاتا ہے، کان بھی سُرخ ہو جاتے ہیں، اِن میں سے آگ سی بھی نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور منہ بھی لٹک سا جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم ذرا حوصلہ سے کام لے کر فوراً یہ سوچنے لگیں کہ سچی بات کہی گئی ہے، ہمیں اسے محسوس نہیں کرنا چاہیے تو پھر ہم اس بات کی تلخی کو بڑی حد تک خوش اسلوبی کے ساتھ برداشت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ہمارا یہ سوچنا کہ بات سچی ہے بُرا کیوں مانا جائے دل میں بڑی وسعت پیدا کرتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ہم اس چیز سے بے نیاز ہو جاتے ہیں کہ بات کہنے والا ہم سے بڑا ہے یا چھوٹا، کمزور ہے یا طاقتور، اپنا ہے یا پرایا ـــ ہماری تمام توجہ اصل بات کی طرف منعطف ہو جاتی ہے اور ہم کہنے والے پر بظاہر یا دل میں خفا ہونے کے

بجائے اس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ ہمیں اپنا نقص کیسے دُور کرنا چاہیے۔

حق بات کے سُننے سے ہماری انا کو ضرور ٹھیس پہنچتی ہے، لیکن اس سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس وقت ہمیں کوئی ایسی بات کہے جس سے ہماری کسی کمزوری کا اظہار ہوتا ہو، تو ہمیں وہ بات سُن کر کسی قسم کی گراوٹ یا کمتری کا احساس نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ اپنے متعلق تنقید کو سُننا بھی اعلیٰ اخلاق کی نشانی ہے۔ اس کے علاوہ یہ ہمارے لیے اصلاحِ حال کا بہترین موقع ہے، یقین کیجیے زندگی میں ایسے مواقع بہت کم حاصل ہوتے ہیں جن میں ہم خود اپنے بارے میں کسی دوسرے کی صحیح اور پُرخلوص رائے سُن سکیں، لوگ صاف بات کہنے سے بالعموم گریز کیا کرتے ہیں، چنانچہ اُن مواقع کو غنیمت سمجھنا چاہیے، جن میں کوئی ہمارے سامنے ہم پر بے لاگ تنقید کرتا ہے، خواہ وہ تنقید سلیقے کے ساتھ ہوئی ہو اور خواہ اس شخص کی سادہ لوحی کی بنا پر اکھڑپن کے ساتھ۔

کھری بات سُن کر اپنی شخصیت میں بلندی کا احساس پیدا کرنا ایسا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ البتّہ اس کے لیے مسلسل مشق کی ضرورت ہے۔ یہ مشق اس شخص کے لیے زیادہ آسان ہوتی ہے جو اپنے آپ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ اپنے آپ پر تنقید کرنے والے لوگ عموماً حق نیوش ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنے خلاف سچ بات سُن کر بہت کم غصّہ آتا ہے۔ سچّی بات سُننے کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کو کسی طور بھی کامل تصوّر نہ کرے۔ اپنے کامل ہونے کا خیال انسان کو اکثر سچ بات سُننے سے روک دیتا ہے، جس کے نتیجے میں مزید ترقّی کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں، جو انسان اپنے آپ کو کبھی کامل نہیں سمجھتا، اس پر ترقّی کی راہیں ہمیشہ کھُلی رہتی ہیں۔ حق نیوشی کی مشق کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ انسان جھُوٹے وقار کا خیال ترک کر دے۔ حق نیوشی جہاں ہمارے

کردار کی ترقی میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے وہاں وہ ہم سے ایک تقاضا یہ بھی کرتی ہے کہ ہم بے بنیاد نام و نمود سے کنارہ کش ہوجائیں، جو شخص وقتی عزت اور نمائشی احترام کا قائل ہوتا ہے۔ بھلا وہ کیسے کھری بات سُننے کی تاب لاسکتا ہے؟ اس کے مقابلہ میں سچ بات سُننے والے انسان کے پاس مادی اور عملی اعتبار سے جو کچھ ہوتا ہے، اس کی بنیادیں بڑی استوار ہوتی ہیں۔ اس کی شخصیت میں کھوکھلا پن نہیں ہوتا ـــــ اس کے ظاہر و باطن بہت کم مختلف ہوتے ہیں ـــ حق نیوشی کی عادت پیدا کرنے کے لیے ایک اور شرط یہ ہے کہ اگر ہمیشہ نہیں تو کبھی کبھی انسان بے لوث ہوسکتا ہو، کیونکہ بعض وقت سچ بات سُننے کے لیے ذاتی مفاد کو پسِ پشت ڈالنا پڑتا ہے۔ ممکن ہے آپ یہ تمام باتیں پڑھ کر سوچ رہے ہوں کہ حق نیوشی کیا ہوئی، اچھی خاصی چلّہ کشی اور "ہمزاد" کو قابو میں کرنے کا عمل ہوا ـــــ اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ اوّل تو مذکورہ بالا تمام باتیں آپ کے اپنے قبضۂ اختیار میں ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی بازار سے خریدنا نہیں پڑتی۔ علاوہ ازیں اگر آپ فی الحال باریکی میں جانا پسند نہیں فرماتے، تو حق نیوشی کے باب میں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے کہا جاچکا ہے، اور وہ یہ ہے کہ سچی بات سُن کر کسی قسم کی گراوٹ کا احساس نہیں ہونا چاہیے فقط یہی ایک بات حق نیوشی کی عادت پختہ کرنے کے لیے کافی و شافی ہوسکتی ہے۔ اگر اس کو ہم ہر سچی بات سُنتے وقت اپنے پیشِ نظر رکھ سکیں۔ ممکن ہے آپ کو اس جگہ بلّی کے گلے میں گھنٹی باندھنے والی حکایت یاد آجائے یا سر کے درد میں صندل گھس کر لگانے والے نسخہ کی طرف آپ کا خیال چلا جائے، لیکن میں اپنے الفاظ کو دوبارہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا اور کہوں گا۔ یقین کیجیے سچی بات سُن کر ہماری شان میں ذرّہ برابر کمی واقع نہیں ہوتی، بلکہ کچھ اضافہ ہی ہوتا ہے۔ یہ تو محض ہمارے سوچنے کا انداز ہے، جو ہمیں خراب کرتا ہے۔ ورنہ آپ جانتے ہیں،

حق نیوشی عالمِ انسانیت کی وہ جگمگاتی ہُوئی اعلیٰ قدر ہے، جس پر تہذیب و تمدن کی ہزار صبحوں کا غرور نچھاور کیا جا سکتا ہے۔